روشِ انقلابؑ

شاعرِ اہل بیتؑ
علامہ نجم آفندی کے مرثیوں کا مجموعہ

تحقیق و تدوین

ڈاکٹر سید تقی عابدی

روشِ انقلاب

شاعرِ اہلبیتؑ

(علاّمہ نجم آفندی کے مرثیوں کا مجموعہ)

تحقیق و تدوین

ڈاکٹر سیّد تقی عابدی

جملہ حقوق بحق مرتب محفوظ

کتاب	:	**روشِ انقلاب**
تحقیق وتدوین اور تنقید	:	ڈاکٹر سیّد تقی عابدی
سنہ اشاعت	:	2006ء
تعداد	:	1000
کمپوزنگ	:	افراح کمپیوٹر سنٹر نئی دہلی۔25
ایڈیشن	:	اوّل
باہتمام	:	**ڈاکٹر شاہد حسین**، نئی دہلی

یہ کتاب

مرتب محقق وناقد ڈاکٹر **سیّد تقی عابدی** (کنیڈا) اور

ناشر **ڈاکٹر شاہد حسین**، شاہد پبلی کیشنز، 2253 دریا گنج، نئی دہلی (انڈیا)

کی اجازت سے شائع کی گئی

رَو میں ہے رَخشِ عمر

نام : **سیّد تقی حسن عابدی**

ادبی نام : تقی عابدی

تخلّص : تقی

والد کا نام : سیّد سبطِ نبی عابدی منصف (مرحوم)

والدہ کا نام : سنجیدہ بیگم (مرحومہ)

تاریخ پیدائش : یکم مارچ 1952ء

مقام پیدائش : دہلی (انڈیا)

تعلیم : ایم بی بی ایس (حیدرآباد، انڈیا) ایم ایس (برطانیہ)
ایف سی اے پی (یونائیٹڈ اسٹیٹ آف امریکہ)
ایف آر سی پی (کنیڈا)

پیشہ : طبابت

ذوق : شاعری اور ادبی تحقیق

شوق : مطالعہ اور تصنیف

قیام : ہندوستان، ایران، برطانیہ، نیویارک اور کنیڈا

شریک حیات : گیتی

اولاد : دو بیٹیاں (معصوما اور رویا) دو بیٹے (رضا اور مرتضٰی)

تصانیف : شہید (1982ء) جوشِ مودّت۔ گلشن رویا۔ اقبالؔ کے عرفانی زاویے، انشاء اللہ خاں انشاءؔ۔ رموز شاعری۔ اظہار حق۔ مجتہد نظم مرزا دبیرؔ۔ طالع مہر۔ سلکِ سلام دبیرؔ۔ تجزیہ یادگار انیسؔ۔ ابواب المصائب۔ ذکر دُربا ران۔ عروسِ سخن۔ مصحفِ فارسی دبیرؔ۔ مثنویاتِ دبیرؔ۔ کائنات نجم۔

زیر تالیف : تجزیہ شکوہ جواب شکوہ۔ رباعیات دبیرؔ۔ فانی شناسیؔ۔ مصحفِ تاریخ گوئی۔ روپؔ کنوارکماری۔ تعشق لکھنوی۔

ڈاکٹر سیّد تقی عابدی

دردِ دل

کس کس سے سوال کروں؟

علامہ نجم آفندی نے کہا تھا:

میں خود ہوں مطمئن اے نجم ادب کی خدمت سے
جگہ نہ دے کہیں تاریخِ روزگار مجھے

① اردو کے مشاہیر شعرائے غزل نے نجم کی قدردانی کیوں نہ کی؟
(195) عمدہ اور اعلیٰ ترین غزلوں کو کیوں نظر انداز کیا گیا؟
کیا 1955ء کا آل انڈیا مشاعرہ یاد نہیں جس میں نجم نے مشاعرہ لوٹ لیا تھا؟ ٥

② اردو کے ترقی پسند تحریک کے نمائندوں نے کیوں نجم کو نظر انداز کیا؟ اردو ادب میں کسان، مزدور، مزدوری اور سرمایہ داروں کے خلاف نظموں میں پہلی آواز علامہ اقبالؔ اور جوشؔ سے قبل نجم کے سوا کس نے بلند کی؟ اگر بقول سلیمانؔ ندوی، حسرتؔ موہانی اسلامی اور سوشلسٹ رجحان رکھ کر بیسویں صدی کے ابوذر غفاری ہوسکتے ہیں اور تحریک کے بھی پسندیدہ شاعر رہ سکتے ہیں تو نجم کی مسلمانی کیوں برداشت نہ ہوئی؟

③ نعت کے پرستاروں نے صدہا نعتیہ آبدار اشعار اور سولہ سے زیادہ نعتوں کو کیوں طاقِ نسیاں کے سپرد کیا؟
کیا نجم کے اس شعر میں کسی کو شک ہوسکتا ہے؟

اے نجم میں ہوں شاعرِ دربارِ رسالتؐ
کیا شک ہے کسی کو مری تصویر کشی میں

④ کیوں افسانہ نویسوں نے عمدہ افسانہ ''چور ماموں'' نہیں پڑھا؟ کیوں ناول نگاروں نے تخلیقی شاہکار ناول ''بندۂ خدا'' کو فراموش کیا؟

شریک حال نہ ہوتی جو نجم خودداری
ہمارے غم کا فسانہ غمِ جہاں ہوتا

⑤ اردو میں کتنے شاعر ہیں جنھوں نے نجم کی طرح چھ سو سے زیادہ عمدہ رباعیاں لکھیں؟ کیوں اردو رباعیات لکھنؤ کے پی ایچ ڈی (Ph.d) کے مقالے میں نجم کا نام تک نہیں؟ جبکہ پانچ اور دس رباعی کہنے والے افراد کا ذکر آب وتاب کے ساتھ ہے۔ کیا اس قسم کے مقالوں پر اعتماد کیا جاسکتا ہے؟

⑥ شاعرِ اہلِ بیتؑ کا خطاب دے کر محبانِ اہلِ بیتؑ کیوں نجم سے غافل ہوگئے؟ مولویوں، خطیبوں نے منبر سے کیوں ان کا پیغام نہیں پہنچایا؟ سلاموں، نوحوں، مرثیوں کو لے کر دوسرے انتقادی کلام کو کیوں تلف کردیا؟ کراچی میں اتنے بڑے شاعر کے جنازے میں کیوں صرف بیس (20) پچیس (25) افراد شریک ہوئے؟

⑦ کیوں نجم کے کلام کو محبانِ اہلِ بیتؑ، گروہانِ نوحہ خوان، پرستارانِ نجم، شاگردانِ رشید، عزیزو اقربا نے انتقال کے تیس (30) برسوں میں بھی شائع نہیں کیا؟ اگرچہ نجم نے کہا تھا:

ہم نجم چار روز کے مہمان ہیں مگر
رہ جائیں گے یہ شعر و ادب کے تبرکات

⑧ اردو ادیبوں اور تنقید نگاروں نے اس بیسویں صدی کے عظیم شاعر سے کیوں غفلت برتی؟ نجم کے (12799) اشعار، (195) غزلیں، (591) رباعیات، (498) قطعات، (16) نعتیں، (81) قصائد، (107) سلام، (144) نوحے، (83) متفرقات کے علاوہ (3) مرثیے، (18) ہندی کلام کے آثار اور کئی نثری کتابیں مطبوعہ اور غیر مطبوعہ موجود ہیں:

آج اردوے معلّٰی کی اشاعت کے لئے
یہ غنیمت ہے کہ نجم نکتہ داں باقی رہا

میں نے حقیقت کو پیش کیا ہے:

نجم بہتر ہے تصنّع کی دلآویزی سے
تلخ لہجہ میں حقیقت کا بیاں ہوجانا

⑨ کانگریس، مسلم لیگ اور دوسرے قومی سیاسی عہدے داروں نے ایسے وطن دوست شاعر کو وطن کی محبت میں کیا دیا؟ جبکہ

ع: منزل انھیں ملی جو شریکِ سفر نہ تھے

کائناتِ نجم ان تمام سوالوں کا جواب رکھتی ہے۔ صرف گردشِ اوراق شرط ہے۔ شاید یہ میری نجمی عقیدت اور اُردو محبت ہو۔ یہ ایک خوشگوار حادثہ تھا جس کے فیض سے میں کائناتِ نجم کو دریافت کرسکا:

یہ بھی اک حادثہ اُردو کی محبت کا ہے نجم
کنجِ عزلت سے جو باہر نکل آیا ہوں میں

خیر اندیش

سیّد تقی عابدی

ڈاکٹر سیّد تقی عابدی

نجم آفندی کا زندگی نامہ

نام	مرزا تجمّل حسین
تخلص	نجم۔ نجمی
شہرت	نجم آفندی
گھریلو نام	نادر مرزا

تاریخ ولادت: رمضان 1330 ہجری مطابق 1893ء

مقام ولادت: اکبر آباد (آگرہ) کٹرہ حاجی حسن جو پیپل منڈی کے پیچھے واقع ہے۔

والد: مرزا عاشق حسین بزمؔ آفندی۔ معروف شاعر اپنے سگے ماموں سید اسمٰعیل حسین منیرؔ شکوہ آبادی متوفی 1880ء کے شاگرد رہے۔ ان کی پیدائش 1860ء میں کٹرہ حاجی حسن آگرہ میں ہوئی۔ شادی آغا حسین صاحب صاحبِ دیوان شاعر کی بیٹی سے ہوئی۔ دوسری شادی ایک انگریز خاتون سے ہوئی۔ آپ بزمؔ تخلص کرتے تھے۔ معروف غزل گو اور مرثیہ گو شاعر تھے۔ بزمؔ آفندی کا انتقال 23 مارچ 1953ء کو ہوا۔

دادا: مرزا عباس ملیح جو مرزا نجف علی بلیغؔ کے فرزند تھے جو مرزا فصیحؔ مشہور مرثیہ گو شاعر کے حقیقی بھائی تھے۔ اسی لیے تو نجمؔ آفندی نے مرزا فصیحؔ کی میراث پر فخر کرتے ہوئے فرمایا:

نجمؔ میں ہوں خاک پائے مسند آرائے فصیحؔ
مدح کی دولت ملی ہے ورثۂ اجداد سے

پردادا: مرزا ہادی علی فیض آبادی۔ مرزا ہادی علی کے تین فرزند تھے۔ (1) مرزا جعفر علی فتیح (2) مرزا نجف علی بلیغ (3) مرزا قتیح۔ ڈاکٹر صفدر حسین مرحوم لکھتے ہیں۔ ''نجم آفندی کے پردادا ہادی علی فیض آبادی حضرت عقیل ابن ابی طالب علیہ السلام کی نسل سے تھے لیکن جب ان کے بزرگ بلاد ایران میں رہنے لگے تو وہاں ''مرزا'' مشہور ہوگئے تھے۔ ہندوستان میں آمد کے بعد ان کے بزرگ شاہجہاں آباد (دہلی) میں سکونت پذیر ہوئے تھے۔

معز الدین قادری اسرار و افکار میں لکھتے ہیں۔ نجم آفندی کے پردادا مرزا ہادی علی فیض آباد کے محلّہ ''مغل پورہ'' میں رہتے تھے چنانچہ نجم آفندی نے اس طرف اشارہ کیا ہے۔

مرے بزرگوں کا اصلی وطن ہے فیض آباد
مجھے بھی شوق تھا دیکھوں میں یہ در و دیوار

اجداد: نجم آفندی کے اجداد ترک نسل سے تعلق رکھتے تھے جو ہجرت کر کے ہندوستان میں آباد ہوئے۔

بھائی بہن: دو بھائی (1) مرزا اعجاز حسین مرحوم اکیس برس کی عمر میں انتقال ہوگیا۔ یہ عمر میں نجم سے بڑے تھے۔

(2) مرزا سلیمان کوکب آفندی، چھوٹے بھائی جن کی صاحبزادی مشہور مرثیہ نگار شاعر باقر زیدی کی شریک حیات ہیں۔ ایک بہن شہزادی فرطیس بانو اختر جہاں کج کلاہ پروین پیدائش 1901 جو بزم آفندی کی دوسری انگریز بیوی کے بطن سے تھیں۔ پروین کج کلاہ عمدہ شاعرہ تھیں۔

شریکِ حیات: 1958ء میں گلے کی کینسر سے انتقال کر گئیں۔ کانپور کے ایک معزز گھرانے کی صاحبزادی تھیں۔

اولاد: (1) پانچ لڑکے۔ جن میں چار لڑکے عباس، کامران، تاجدار اور تسلیم بچپن میں مر گئے اور اکلوتے بیٹے ہمایوں مرزا المتخلص سہیل آفندی حیات ہیں اور حیدرآباد

دکن میں مقیم ہیں۔

(2) سات لڑکیاں۔ ایک بیٹی کا کمسنی میں انتقال ہوگیا۔ دوسری لڑکی ناکتخدا تھی۔ دو بیٹیاں شادی کے بعد پاکستان چلی گئیں اور دو بیٹیاں ہندوستان میں مقیم رہیں۔

تعلیم وتربیت: 1- نجم آفندی کی اردو اور فارسی تعلیم گھر پر ہوئی۔

2- قرآن مجید اپنے چچا مرزا ہادی علی سے پڑھا

3- مفید عام اسکول آگرہ سے انگریزی میں مڈل پاس کیا۔ اس اسکول میں اردو فارسی مولوی سلامت اللہ سے اور انگریزی اسکول کے ہیڈ ماسٹر راج کمار سے پڑھی۔

4- اسرار و افکار کے دیباچہ میں معز الدین قادری لکھتے ہیں۔ ''نجم آفندی کو اردو فارسی اور انگریزی کے علاوہ ہندی زبان میں بھی درک ہے۔ ان کی ہندی زبان میں بھی تصنیفات ملتی ہیں۔''

5- ڈاکٹر ذاکر حسین فاروقی دبستان دبیر میں لکھتے ہیں۔ نجم آفندی اردو، فارسی اور عربی اچھی جانتے ہیں اور انگریزی میں بھی اچھا درک رکھتے ہیں۔

6- ڈاکٹر سید نواز حسن زیدی نے نجم آفندی فکر وفن میں لکھا۔ ''اردو فارسی کی حد تک تو یہ بات درست ہے لیکن محض قرآن مجید ناظرہ پڑھنے کو عربی تعلیم کا حصول سمجھ کر مالک رام اور ڈاکٹر ذاکر حسین کو مغالطہ ہوا ہے۔ خود نجم آفندی نے اپنے خط میں عربی نہ پڑھ سکنے کے بارے میں لکھا ہے۔

7- اردو فارسی اور انگریزی کتابوں کے مطالعہ کا شوق تھا۔ انھیں گھر پر عام طور سے انگریزی ناول کو بھی مطالعہ کرتے ہوئے دیکھا گیا۔

8- نجم آفندی شمشاد حسین کے نام خط میں لکھتے ہیں ''میری تعلیم اس زمانے کے مڈل تک ہوگی مگر کم ازکم انگریزی کی دو ہزار کتابیں ہر قسم کی میری نظر سے گزری ہیں۔

شکل وصورت: شکل وصورت تصویر سے ظاہر ہے جو اس کتاب میں شامل ہے۔ نجم آفندی کا قد تقریباً پانچ فٹ تھا۔ بدن چھریرہ، رنگت سرخ وسپید تھی۔ چہرہ کول خوبصورت ناک اور باریک ہونٹ کے ساتھ بڑے کان اور سر بھی نسبتاً بڑا تھا۔ آخری عمر میں بال

بہت کم رہ گئے تھے۔ خشخشی داڑھی جو مونچھوں سے متصل تھی۔ آواز رعب دار اور چہرے پر ہمیشہ مسکراہٹ رہتی تھی۔

وضع اور لباس: نجم آفندی نستعلیق شخصیت تھے۔ وہ مشرقی روایات کے پاسدار اور اسلامی تہذیب کے نمونہ تھے۔ جوش ملیح آبادی نے ساقی جوش نمبر میں لکھا۔ ''حضرت نجم آفندی جو اس قدر دین دار و پابند وضع بزرگ ہیں کہ قہقہہ مارنے کو بھی خلافِ شرع سمجھتے ہیں۔''

نجم آفندی کے لباس میں سادگی تھی۔ وہ عام طور پر سفید شیروانی، سفید پائجامہ، مخمل کی کالی ٹوپی پہنتے تھے۔ کبھی کبھار کالی شیروانی پر شال اوڑھ لیتے تھے۔ پاؤں میں معمولی سلیپر یا جوتا ہوتا۔ ہاتھ میں ہمیشہ چھڑی رکھتے تھے۔ عینک صرف حسبِ ضرورت لگاتے۔

غذا و خوراک: نجم آفندی کم خوراک تھے۔ دیسی گھی اور گڑ سے شدید رغبت تھی۔ ان کی گھی اور گڑ کی چاہت کی کئی داستانیں لوگوں نے بیان کی ہیں۔

سیرت و کردار: ہم نجم آفندی کی سیرت اور عالی کردار کے ساتھ عجز و انکساری کا مختصر خاکہ معز الدین قادری اور ذاکر حسین فاروقی کی تحریروں سے پیش کرتے ہیں۔ اسرار و افکار کے دیباچہ میں معز الدین قادری نے لکھا ہے۔ ''خاندانی روایات مذہبی تعلیم و تربیت اسلام کی عظیم شخصیتوں کے نقوش قدم کو اپنا راستہ بنانے کی سعی و تمنا نے ان کو کافی متوازن، معتدل مزاج اور بنی نوع انسان کا ہمدرد بنادیا ہے۔ ان کی آنکھوں میں بصیرت کی چمک ہے اور سنجیدگی کے نہ جانے کتنے راز ہیں۔ انھیں بنی نوع انسان سے محبت ہے۔ شخصی اور مذہبی عقائد پر خود سختی کے ساتھ کاربند ہیں لیکن سیرت و کردار میں کہیں بھی ''ملاپن'' یا پندار زہد'' کے نتیجہ میں پیدا ہونے والا سوانگ موجود نہیں۔ بُردبار، حلیم، خوش خلق اور مصیبتوں میں مسکرانے والی شخصیت ان کے سارے کلام سے جھلکتی ہے اور انھیں یہ کہنے کا حق ہے

میری تلاش راہ پر ہنستے ہیں آج قافلے
شمع بنائی جائے گی کل میری گردِ راہ کی

بقول جوشؔ ملیح آبادی۔ جہاں تک طبائع کا تعلق ہے، باپ بیٹے میں زمین و آسمان کا فرق تھا۔ وہ ایک رنگین مزاج شاعر تھے اور ان کو رنگینی کبھی چھو کر نہیں گئی تھی۔ وہ سراپا رند تھے اور یہ سرتا بہ قدم متقی اور خشک قسم کے متقی تھے۔

دبستانِ دبیرؔ میں ڈاکٹر ذاکر حسین فاروقی بیان کرتے ہیں: ''مروّت وضع داری، ایفائے وعدہ، حُسنِ معاشرت اور بڑے چھوٹوں کے ساتھ یکساں برتاؤ آپ کے کردار کی وہ خوبیاں ہیں جو ہر شخص کے دل میں جگہ پیدا کر لیتی ہیں۔ نجمؔ صاحب نے اپنی زندگی کے جو اصول بنائے تھے وہ تا حیات ان پر کاربند رہے اور اخلاقی و روحانی اعتبار سے انھوں نے ایک کامیاب زندگی گزاری اور ان کی کامیاب زندگی ''قابل رشک موت'' کی ضامن بن گئی۔ بقول خود:

کچھ شعر جو منقبت میں کہہ لاتا ہے
اس خواب سے اپنے دل کو بہلاتا ہے
موزوں ترے کردار پہ بھی ہے یہ خطاب
تو شاعرِ اہل بیت کہلاتا ہے

شغل و ملازمت:

1- ریلوے محکمہ میں کلرک کی حیثیت سے ملازمت کا آغاز کیا۔ اس وقت نجمؔ کی عمر بیس سال تھی۔
2- پھر دہلی میں ملازمت کی۔
3- کالکا اسٹیشن اور غازی پور اسٹیشن پر کچھ عرصہ ملازم ہوئے۔
4- تحریک ترکِ موالات سے متاثر ہوکر ریلوے کی ملازمت ترک کر دی اور تلاش معاش میں ردولی پہنچے اور کچھ عرصہ کاشتکاری کی۔
5- جونیئر پرنس معظم جاہ شجیعؔ کے دربار سے منسلک ہوئے۔ ان کے سپرد پرنس کے کلام کی اصلاح تھی۔ تنخواہ بھی اس کام کی پاتے تھے۔ نجمؔ کی ماہانہ تنخواہ دوسو روپے ماہوار تھی۔
6- دربار سے علاحدہ ہوکر مالی پریشانیوں میں بسر کی اور اپنی خودداری کو نبھانے اور پیٹ

کی آگ بجھانے کے لیے چھتہ بازار حیدرآباد میں جوتوں کی دکان تک کھولی۔
تف برتو اے چرخِ پیر کہ شاعرِ اہل بیتؑ کو اتنی بڑی قوم تنگ دستی میں سہارا نہ دے سکی جبکہ تمام قوم اور تاجر ان کے کلام سے روحانی اور اقتصادی فائدہ اٹھا رہے تھے۔ اسی لیے تو اپنے خطوط میں اس طرح گلہ کیا ''آج ہندوستان میں تبت سے راس کماری تک میرے نوحے پڑھے جا رہے ہیں لیکن مالی فائدہ دوسرے اٹھا رہے ہیں'' 'کاروان ماتم' لاہوروالوں نے میری اجازت و اطلاع کے بغیر شائع کرلی ہے۔ لکھا تو جواب تک نہیں دیتے۔ یہ قدر دانی ہو رہی ہے۔ ہم تکلیف اٹھا رہے ہیں اور یہ نفع کما رہے ہیں۔''

شاعری کا آغاز: ۱۲ سال کی عمر میں شاعری کا آغاز کیا۔ ابتدا غزل گوئی سے کی۔ شاہ نیاز وارثی کی غزل پر مصرعے لگائے

زہے عزّو جلالی بو ترابی فخرِ انسانی
علیِ مرتضیٰ مشکل کشائی شیرِ یزدانی

پہلا مشاعرہ: جس مشاعرے سے نجمؔ کی شاعری کا تعارف ہوا وہ خود ان کے گھر کے سامنے منعقد کیا گیا تھا جس میں اکابر شعرا نے شرکت کی تھی۔ نجمؔ کی غزل کا مطلع تھا:

چاندنی میں تم ذرا گھر سے نکل کر دیکھتے
قبرِ عاشق اور ایک میلی سی چادر دیکھتے

شاگردی: شاعری کے آغاز میں اپنے والد بزمؔ آفندی کی شاگردی کی لیکن بہت جلد ہی اصلاح سے بے نیاز ہو گئے۔

صحبت اساتذہ: نجمؔ آفندی کو گھریلو ماحول کے علاوہ اپنے دہلی کے قیام کے دوران نواب سائلؔ دہلوی، بے خودؔ دہلوی، پنڈت امرناتھ ساحرؔ، منشی امیر اللہ تسلیمؔ، شوکت علی میرٹھی، عبدالرؤف عشرتؔ، ناصر علی خاں مچھلیؔ شہری اور وقارؔ کانپوری جیسے شعرا شامل تھے۔ انھیں اساتذہ نے نجمؔ کی شعری صلاحیتوں سے متاثر ہو کر کہیں اس نوجوان شاعر کو صدر مشاعرہ بنایا تو کہیں راجہ پنڈراول نے ان کی شاہکار نظم کو (1800) سو روپیوں

میں خرید کر یہ رقم یتیم خانہ کی خدمت کے لیے وقف کردی۔ کبھی محفل مقاصدہ میں صفی لکھنوی کو یہ کہتے ہوئے سنا گیا کہ ''نجم صاحب ہم نے بائیس (22) سال اس محفل میں چراغ جلایا ہے اب آپ کی باری ہے۔''

خطاب: ناصر الملت نے نجم آفندی کو ''شاعر اہلبیت کا خطاب دیا جو نجم آفندی کے مسلسل سلام اور قصیدہ نگاری کا اثر تھا۔

یہاں یہ بات بھی خارج از محل نہیں کہ نجم آفندی کے دادا کے بھائی مرزا فصیح کو خلافت عثمانیہ کی جانب سے آفندی خطاب کعبتہ اللہ اور حاجیوں کی خدمت کرنے پر دیا گیا تھا جو نسلاً بعد نسل استعمال ہوسکتا تھا۔

ہم عصر شعراء: حالی، اکبر الہ آبادی، اقبال، سائل دہلوی، منشی امیر اللہ تسلیم، نسیم، حسرت موہانی، صفی لکھنوی، مرزا اوج، دولھا صاحب عروج، مرزا ثاقب، آرزو لکھنوی وغیرہ بزرگ عمر ہم عصر شعرا تھے جب کہ ان کے ہم عمر شعرا میں فانی، جوش، صدق جائسی، یگانہ، سیماب، مہذب لکھنوی، نسیم امروہوی، رئیس امروہوی، سید آل رضا وغیرہ شامل تھے۔

تلامذہ: نجم آفندی کے شاگردوں کی تعداد بہت زیادہ ہے۔ خود انھوں نے جو فہرست جلیس ترمذی کو روانہ کی تھی اس میں (69) نام تھے۔ وہ بعد میں بڑھ کر (72) ہوگئی، اور کچھ اس طرح ہے جسے ڈاکٹر سید نواز حسن زیدی نے نجم آفندی فکر و فن میں نقل کیا ہے۔ رعنا اکبر آبادی، جعفر مہدی، رزم رودلوی، صفدر حسین کاظمی، عبد السعید رشک، عابد مرحوم، وزارت علی، علی انجم اکبر آبادی، مرزا عبد الکریم مضطر، کوکب اکبر آبادی، جلیس ترمذی، انتظام الحسینین، خاور نوری، سعید شہیدی، مرزا عادل، ساجد رضوی، شاہد حیدری، عازم رضوی، قائم جعفری، عباس عابدی، خورشید جنیدی، باقر منظور، طاہر عابدی، خواجہ ضمیر، کاوش حیدری، منجو قمر، راحت عزمی، تصور کرت پوری، عباس زاہد، شہید یار جنگ، ہشیار جنگ، ڈاکٹر اختر احمد، تبسم نظامی، طالب رزاقی، حرماں خیر آبادی، حاصم جمیل، ساحر نجمی، سعید السائمہ، زیبا رودلوی، پرنس معظم جاہ شجیع، ہاشم جاں بہادر، اختر زیدی، حسن مدنی، اثر غوری، کاظم رشک، شاغل حیدر آبادی، صمیم

حیدر، محبؔ جاورہ، صادقؔ نقوی، سوزؔ رضا ترمیم، تقیؔ عسکری، اقبالؔ عابدی، سید جعفر حسنین، زاہدؔ رضوی، ظہیرؔ جعفری، آغا ناجرؔ، باذلؔ عباس ضیغم، سائرؔ، ثاقبؔ، سعادت نظر، عبدالحیؔ خاں، شارقؔ، بانوؔ سید پوری، نظیرؔ سیہوری، عقیلؔ نجمی، سہیلؔ آفندی، روپؔ کماری، بیدارؔ نجفی اور وفاؔ ملک پوری وغیرہ۔

ڈاکٹر نواز حسن زیدی لکھتے ہیں کہ تلامذہ کی اصلاح کے وقت نجم آفندی کے ہاں وہی جذبہ کارفرما ہے جسے عشقِ اہل بیت کے نام سے موسوم کیا جا سکتا ہے۔ تلامذہ کے کلام کی اصلاح کے لیے باقاعدہ اصول وضع کر رکھے تھے۔ شاگردوں کے خطوط کے جواب میں لکھتے ہیں۔ ''مجھے امید نہیں کہ جلد تمھارا کلام دیکھ کر بھیج سکوں گا۔ از روئے انصاف سلسلہ وار دیکھتا ہوں'' آج کل چار طرف سے پاکستان اور ہندوستان سے اصلاح کا کلام آرہا ہے۔ سر اٹھانے کی مہلت نہیں۔ دماغ بھی کام دیتا ہے تو ہاتھ کانپتا ہے کس کس کو منع کروں اور کیسے ممکن ہے مدحِ اہل بیت کا مسئلہ ہے۔

مدت مشق سخن: تقریباً ستر (70) سال

مسافرت برائے شاعری: دہلی، کانپور، لکھنؤ، حیدرآباد، کراچی، کلکتہ، بنارس، لاہور ہی نہیں بلکہ دور دراز کے چھوٹے مقامات پر بھی تبلیغ پیامِ اہل بیت میں مشغول رہے۔ چنانچہ فیض آباد، بریلی، بارہ بنکی، سیتاپور، بھرت پور، اجین، مدراس اور بلرام وغیرہ کے لوگ بھی موصوف کے کلام کے دلدادہ رہے۔

زیارت عتبات عالیہ: 1950ء اگست میں زیارتوں کے لئے عراق گئے اور مختلف مقامات مقدسہ پر حاضری دی اور اپنے تاثرات کو منظوم لکھ کر ''تاثرات زیارت'' کے عنوان سے شائع کیا۔

تصنیفات: راقم کو کائنات نجم آفندی مرتب کرتے ہوئے مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔ نجم آفندی کی تصانیف تقریباً عنقا ہیں۔ نجم آفندی کی چالیس (40) سے زیادہ تصانیف شائع ہوئیں۔ سب سے پہلی تصنیف ان کے کلام کا مجموعہ 1917 میں اور آخری تصنیف

''لہوقطرہ قطرہ'' ان کے انتقال کے چار سال بعد 1979ء میں شائع ہوا۔ علامہ ضمیر اختر نقوی نے لکھا ہے کہ نجم آفندی نے حیات میں چند تصانیف مرتب کی تھیں مثلاً ''گلدستہ نعت'' ''مذہبی رباعیات'' ''قومی اور مذہبی نظموں کا مجموعہ'' ''خودنوشت سوانح حیات'' جو نامکمل رہ گئی تھی جو کبھی شائع نہ ہوئیں۔ نیز نجم کے مضامین کا کوئی مجموعہ بھی ترتیب نہیں دیا گیا۔

نجم مرحوم کی تصانیف کی فہرست جو ضمیر اختر نقوی نے مرتب کی ہے یہاں پیش کی جارہی ہے۔ باضافہ چند تصانیف جو بعد میں شائع کی گئی ہیں۔

نمبر شمار	نام کتاب	سن طباعت	مطبع	تفصیلات
.1	پھولوں کا ہار	1917ء	آفندی بک ڈپو، آگرہ	پہلا مجموعہ کلام۔ ادبی، اخلاقی قومی نظموں کا مجموعہ وہ نظمیں جو شیعہ کانفرنس میں پڑھی گئی تھیں۔
.2	قصائد نجم	1943ء	آفندی بک ڈپو، آگرہ	رباعیات (32) قصائد اور نظمیں (25)
.3	تہذیب موذت	1943ء	تاج پریس، یوسف آباد، حیدرآباد	رباعیات (140)
.4	اشاراتِ غم حصہ اول	1938ء	احباب پبلشرز، لکھنؤ	نوحوں کی بیاض (32) نوتے
.5	اشاراتِ غم حصہ دوم	1938ء	احباب پبلشرز، لکھنؤ	نوحوں کی بیاض (33) نوتے
.6	اشاراتِ غم حصہ سوم	1938ء	احباب پبلشرز، لکھنؤ	نوحوں کی بیاض (21) نوتے
.7	کربل کی آہ	———	کتب خانہ اثناعشری، لکھنؤ	جدید نوحہ جات (9) نوتے
.8	آیاتِ ماتم	1361ھ	نظامی پریس، لکھنؤ	نوحوں کی بیاض
.9	تصوراتِ غم	1943ء	مکتبہ ناصری گولہ گنج، لکھنؤ	نوحوں کی بیاض

نمبر شمار	نام کتاب	سن طباعت	مطبع	تفصیلات
.10	کربل نگری	1361ھ	مکتبہ ناصری گولہ گنج، لکھنؤ	سیزدہ صد سالہ یادگار حسینی پر لکھی گئی نظم (اردو۔ ہندی)
.11	اسلام پوتھی	1380ھ	امامیہ مشن لکھنؤ	طویل مثنوی، آغاز اسلام سے ہجرت حبشہ تک (اردو۔ ہندی)
.12	فتحِ مبین	1943ء	نظامی پریس لکھنؤ	ایک مرثیہ۔ 5 سلام، 9 رباعیات
.13	بیاضِ حجم	1950ء	مکتبہ سلطانی، بمبئی	نوحہ جات، (حصہ اول، 53 نوحے، حصہ دوم 81 نوحے)
.14	شاعرِ اہل بیتؑ جیل میں	1939ء	مکتبہ ناصری، گولہ گنج، لکھنؤ	قومی نظموں اور قطعات کا مجموعہ
.15	حسینی سنسار	1364ھ	مکتبہ ناصری گولہ گنج، لکھنؤ	نوحہ جات
.16	کاروانِ ماتم	———	کتب خانہ اثناعشری لاہور	(54) نوحے اور سلام
.17	پریم بھکتی	———	مکتبہ ناصری، گولہ گنج، لکھنؤ	ہندی نظموں کا مجموعہ، اردو رسم الخط میں
.18	دارالسلام	———	مکتبہ ناصری، گولہ گنج، لکھنؤ	جدید رنگ کے سلام
.19	تاثراتِ زیارت	1950ء	الکٹرک پریس، حیدرآباد	زیارت سے متعلق منظوم خراج عقیدت

نمبر شمار	نام کتاب	سن طباعت	مطبع	تفصیلات
.20	نصاب دینیات	1364ھ	مطبع حیدری، حیدرآباد	بچوں کے لئے مختصر دینی احکامات (نثر)
.21	شہیدوں کی باتیں	1952ء	رضا کار بک ڈپو، لاہور	کربلا والوں کے اقوال اور کارنامے (نثر)
.22	حسینی اور ہندوستان		مکتبہ ناصری گولہ گنج، لکھنؤ	ہندوستان کا امام حسینی سے روحانی تعلق (نثر)
.23	لغات المذہب	1961ء	رضا کار بک ڈپو، لاہور	ایک ہزار مذہبی الفاظ پر مشتمل لغت (نثر)
.24	چوراموں	1349ھ	زاویہ ادب، حیدرآباد	بچوں کے لئے مختصر اخلاقی افسانہ (نثر)
.25	چاند کی بیٹی	—	—	—(نثر)
.26	پھول مالا	—	—	—(نثر)
.27	معراجِ فکر	1959ء	رضا کار بک ڈپو، لاہور	مرثیہ
.28	اسرار و افکار	1971ء	ادارۂ قدر ادب، حیدرآباد	چار سو رباعیات و قطعات
.29	قصائد نجم	1372ھ	تاج پریس، حیدرآباد	سولہ (16) قصائد کا مجموعہ
.30	جانِ کربلا	1993ء	مکتبہ ناصری، گولہ گنج، لکھنؤ	(نوحے + سلام)
.31	معرکۂ غم		مکتبہ ناصری، گولہ گنج، لکھنؤ	(نوحے + سلام)
.32	دکھ کا ساگر		مکتبہ ناصری گولہ گنج، لکھنؤ	(نوحے + سلام)

نمبر شمار	نام کتاب	سن طباعت	مطبع	تفصیلات
.33	کاروانِ عزا	———	عزادار بک ڈپو	نوحے اور سلام
.34	ترقی کی برکتیں	———	———	——— (نثر)
.35	قصاید قدسی	———	مطبوعہ شمسی پریس، آگرہ	قصائد
.36	ستارے	1364ھ	دکن اُردو اکادمی	نظموں کا مجموعہ
.37	بندۂ خدا	1969ء	کاظمی پرنٹنگ پریس حیدرآباد	ایک مذہبی ناول (نثر)
.38	نفس اللہ	———	دائرہ الکٹرک پریس، حیدرآباد	——— (نثر)
.39	ترقی پسندوں کے نام	———	———	——— (نثری کتاب)
.40	رباعیاتِ نجم آفندی	———	امامیہ کتب خانہ لاہور	(145) رباعیات
.41	پنجتنی قصائد (غیر مطبوعہ)	———	———	قصائد
.42	رباعیات	1976ء	اعجاز پرنٹنگ پریس حیدرآباد	(30) رباعیات
.43	لہو قطرہ قطرہ	فروری 1979ء	پرنٹنگ محل، ناظم آباد کراچی	پچاس منتخب غزلوں کا مجموعہ

وطن پرستی اور انگریز نفرت: سچ تو یہ ہے کہ برصغیر نے علامہ نجم آفندی کے ساتھ انصاف نہیں کیا اور آزادی کے بعد ع: منزل انھیں ملی جو شریک سفر نہ تھے۔

وطن دوستی انگریز نفرت اور قومی محبت نجم آفندی کے ریشہ ریشہ میں کوٹ کوٹ کر بھری تھی۔ ذیل میں چند واقعات اور حکایات ہمارے دعویٰ کے ثبوت ہیں۔

1. ابتدائی عمر میں جب اسکول میں کسی ہندو لڑکے سے جھگڑا ہونے کے بعد ان کے ہیڈ ماسٹر راج کمار کے جملہ ''تم دونوں مل کر تیسرے کو کیوں نہیں مارتے؟'' نے فوراً

انگریزوں کے خلاف متحد ہونے کی ترغیب دی۔ چنانچہ اپنی خودنوشت میں اس واقعہ کا ذکر کرتے ہوئے کہتے ہیں۔ ''میرے دل نے آواز دی کہ تیسرے سے مراد انگریز ہے جس کی غلامی کی صعوبتیں ہم برداشت کررہے ہیں لیکن اس کو مار بھگانے کی جسارت نہیں کرتے۔''

2. نجم آفندی کی کھدر پوشی سے تنگ آکر ان کے انگریز افسر نے ان کا تبادلہ سزا کے طور پر آسنسول کردیا۔ چنانچہ بعد میں نجم نے تحریک ترکِ موالات سے متاثر ہوکر سرکاری ملازمت سے ہمیشہ کے لئے استعفےٰ دے دیا۔

3. انگریزوں کے استعمار سے بیزار ہوکر زمانۂ طالب علمی میں ایک چھوٹی سی انجمن بنائی جس کا خفیہ ایجنڈا انگریزوں سے ان ہی کے ہتھیاروں سے مقابلہ اور قومی ملی یکجہتی تھا۔ اس انجمن کے ممبر ایک خاص قسم کی انگوٹھی پہنتے تھے۔ کچھ عرصہ بعد یہ انجمن رشتوں کے بھائی کی سازش سے ختم ہوگئی۔

4. سرکاری ملازمت سے علاحدگی کے بعد قومی اور مذہبی رجحان نے تقویت پائی چنانچہ ایک طویل پچیس(25) بند کی نظم ''دُرِ یتیم'' لکھی جو ''پھولوں کا ہار'' مجموعۂ کلام میں شامل ہے اور اس نظم کے ساتھ یہ نوٹ بھی لکھا ہے کہ یہ وہی نظم ہے جس نے شیعہ کانفرنس کے آٹھویں اجلاس منعقدہ الٰہ آباد میں حشر برپا کردیا تھا اور جس پر راجہ سید ابوجعفر صاحب نے ساڑھے چار ہزار روپے نچھاور کردیے تھے۔

5. نجم آفندی نے اپنی تصنیف ''ترقی کی برکتیں'' میں ہندو مسلم اتحاد پر زور دیتے ہوئے لکھا۔ اس وقت ہندو مسلم اتحاد کی بہترین صورت یہ ہے کہ دونوں قوموں کے نوجوان اٹھ کھڑے ہوں اور اپنے طاقت ور بازوؤں کا صحیح مصرف کریں اور اپنے مضبوط ہاتھوں سے فساد روک کر ملک کی سب سے بڑی خدمت کریں۔

6. نجم آفندی جلیس ترمذی کے خط میں لکھتے ہیں: ہندو قوم کے افراد نے گاندھی جی کو ختم کرکے دنیا کو یہ بتادیا ہے کہ ہندوستانی ذہنیت کہاں تک پست ہوسکتی ہے۔

7. نجم آفندی کانگریسی تھے اور اسی لئے کانگریسی مشاعرے بھی کروائے۔ ایک مشاعرے

میں تو ردیف ''کھدر'' رکھی گئی۔ انگریز دشمنی اور وطن دوستی نے نجم کو کانگریسی بنا دیا۔ اپنی خودنوشت میں لکھتے ہیں۔''ہم نے ایسے بھی مشاعرے کئے ہیں جن کا مقصد حکومت کے خلاف پروپیگنڈہ کرنا تھا۔ ایسے مشاعروں کو کانگریسی مشاعروں کا نام دیا جاتا تھا۔میرے ایک دوست برہم سروپ خارمیرٹھی میری طرح پکے کانگریسی تھے۔

8. ترقی کی برکتیں میں لکھتے ہیں: ''ہندوستان کی بدقسمتی سے ہندو مسلم اختلاف پیدا ہوا۔ تضاد بڑھنے لگا اور آج وہ نوبت آئی کہ مسلم لیگ کو پاکستان کی تجویز پیش کرنی پڑی۔

صدمات: 1. سرکاری نوکری سے استعفیٰ کے بعد مالی بحران سے دوچار رہے۔ ماہنامہ ''مشورہ'' جاری کیا لیکن مالی حالت بدتر ہوگئی۔

2. پرنس معظم جاہ کے شاہانہ مزاج کو برداشت نہ کر سکے اور نوکری ترک کردی۔ کچھ دنوں کی فارغ البالی پھر مالی بحران میں تبدیل ہوگئی۔

3. 1953ء میں والد کا انتقال ہوگیا۔

4. 1958ء میں اہلیہ کا طویل علالت کے بعد انتقال ہوگیا۔

5. برادر خرد کوکب آفندی اور دو بیٹیوں کا پاکستان میں ہمیشہ کے لئے آباد ہونا۔

علالت اور مرض الموت: نجم آفندی کو پرنس معظم جاہ شجیع کی دربارداری نے نیند کی گولیوں کا محتاج کردیا تھا، چنانچہ آخری عمر تک ان زہریلی دواؤں کا اثر باقی رہا۔ اعصاب میں تناؤ کم خوابی، لاغری اور ضعف کے علاوہ آخری عمر کے حصے میں معدہ، جگر، قلب کی بیماریاں اور رعشہ وثقل سماعت سے دوچار رہے۔ آخری عمر جو پاکستان میں گزری عموماً بہت کم باہر نکلتے تھے اور زیادہ تر بستر پر لیٹے رہتے تھے۔

پاکستان میں: 1. نجم آفندی پہلی بار اپریل 1971ء میں بمبئی سے بحری جہاز میں سوار ہوکر کراچی کی بندرگاہ پر اترے۔ کراچی میں چند مہینے قیام کر کے وہ لاہور گئے پھر کراچی آتے جاتے رہے۔ نجم صاحب محافل شعروسخن، مشاعروں مسالموں، مقاصدوں اور مجلسوں میں شرکت فرماتے رہے۔ پاکستان میں تقریباً ہر بڑے اور معروف ادیب،

شاعر اور خطیب سے ملاقاتیں رہیں۔ ان کا کلام روزناموں، رسالوں، جریدوں میں وقتاً فوقتاً شائع ہوتا رہا۔ پاکستان کے مختلف شہروں میں قیام کے دوران بعض اوقات اپنی یادداشتیں ایک ڈائری میں بھی مرتب کیں جو ان کی ملاقاتوں اور محفلوں کی عمدہ یادگاریں ہیں۔

وفات : تاریخ 17/ذی الحجہ 1395 ہجری مطابق 21/دسمبر 1975ء

وقت : 9½ بجے صبح

مقام : کراچی

دن : اتوار

غسل میّت : وصیّت کے مطابق مکان پر ہوا

نمازمیت : بارگاہ رضویہ سوسائٹی میں پڑھائی گئی

دفن : سخی حسن دربار کے قبرستان واقع نارتھ ناظم آباد ہوا۔ شفیق اکبرآبادی نے تلقین پڑھائی۔ سوئم کی مجلس رضویہ سوسائٹی کے امام باڑے میں ہوئی۔ سید ضمیر نقوی صاحب نے مجلس پڑھی۔ جنازہ میں صرف پچیس تیس افراد نے شرکت کی۔

قطعات، اشعار اور مصرعہ تاریخِ وفات

1. جناب نسیم امروہوی:

لکھ دو نسیم باکمال قبر پہ سالِ انتقال
بقعۂ پاک محوِ خواب شاعرِ اہلِ بیتؑ نجم

1975ء

2. جناب رئیس امروہوی:

فراقِ نجم آفندی مرحوم
"غروب انجم نجم" اے قلم لکھ

1395ھ

3. جناب فیضؔ بھرت پوری:

رحلت شاعرِ فنا فی اللہ
حجم آفندی اکبر آبادی

1975ء

4. جناب ساحرؔ لکھنوی

سال رحلت کے لئے قبر پہ لکھ دو ساحرؔ
حجم ہے دامنِ مدفن میں ستارے کی طرح

1395ھ

5. جناب کسرتیؔ منہاس:

دُریک دانہ نکتہ داں شاعر

1395ھ

شاعرِ نکتہ داں گرامی تبار

1975ء

6. جناب نیسانؔ اکبرآبادی

تذکرۂ اہلِ بیت جس کا تھا شغلِ سخن
خلد میں وہ آگیا شاعرِ شیریں نوا

1975ء

7. جناب خلشؔ پیر اصحابی:

الف سے الم کے خلشؔ اب تو یوں
ہے لکھا غم حجم دائم رہا

1395ھ = 1394 + 1

8. جناب باقرؔ امانت خوانی:

اس طرح باقرؔ نے کھینچا منظرِ سالِ وفات
اب فلک سے شاعری کے حجم ٹوٹا جلوہ ریز

1975ء

9. پروفیسر فیضی:

بتائید الٰہی یہ شرف فیضی انہی کا تھا
عزادارِ شہید کربلا تھے نجم آفندی

1975ء

10. جناب شائق زیدی:

رہے وہ اے شائق بہ تجمل — شاعرِ اہل بیتؑ جہاں میں
پڑھتے ہوئے آیاتِ ماتم — نجم گئے ہیں باغِ جناں میں

1395ہجری

11. جناب فضل الدین فدا

تعزیت نامہ پاسدار اہل حق

1395ہجری

وفاتِ حسرت آیات جلیل القدر

1975ء

مرجع کرم خسروِ اقلیمِ دانش

1975ء

برگزیدۂ رحمٰن نازش ملّت نجم آفندی اعلی اللہ مقامہ

1975ء

وحیدِ زماں بلند آستاں نور اللہ مرقدہ

1395ہجری

یہ صدمہ کس قدر غم آفریں ہے — نظر بے چین دل اندوہ گیں ہے
فدا لکھ نجم کی تاریخ رحلت — بلا شک ساکنِ خلدِ بریں ہے

1395ہجری

تعداد کل کلام مطبوعہ اور غیر مطبوعہ

علاّمہ نجمؔ آفندی

نمبر شمار	صنفِ سخن	تعداد	تعداد اشعار
.1	غزلیں	195	1932
.2	رباعیات	591	1182
.3	قطعات	498	1001
.4	نعت	16	304
.5	قصاید	81	2519
.6	سلام	107	1375
.7	مراثی	3 (209بند)	627
.8	نوحے	144	2237
.9	تاثیر زیارات	10	128
.10	متفرقات	83	1036
.11	ہندی کلام	18	458
کل اشعار = (12799)			

ڈاکٹر مقام حسین جعفری

فتحِ مبین کا اجمالی خاکہ

حجم آفندی کے مرثیے کی زبان سلیس اور سادہ ہے۔ اندازِ بیان میں تاثیر ہے جو حجم کے خلوص کی آئینہ دار ہے لیکن ان کی مقبولیت اور شہرتِ دوام کے ضامن اُن کے نوحے اور ماتم ہیں جو ''اشاراتِ غم'' ''آیاتِ غم'' اور ''تصوراتِ غم'' میں شامل ہیں۔ جن کی نمایاں خصوصیات درد و غم، سوز و گداز، تبلیغی عنصر، پیام امن و آشتی، واقعہ نگاری، جذبات نگاری، مرقع کشی، خلوص و نغمگی، ہندی الفاظ کا برمحل استعمال اور محاسنِ زبان ہیں۔ ''آیاتِ ماتم'' میں دو مسدس خاص طور سے قابلِ ذکر ہیں۔ ''تیرہ سو برس بعد'' اور ''رخصتی سلام'' مسدس کے ضمن میں حجم کے دو مرثیوں کا تذکرہ بھی ضروری ہے۔

''فتحِ مبین'' اور ''معراجِ فکر'' دونوں مرثیے حجم کے شاہ کار مانے جاتے ہیں لیکن ان کی تکنیک قدیم[1] مرثیوں کی تکنیک سے مختلف ہے۔ اس لیے یہ جدید مرثیوں کی زد میں آتے ہیں۔ بیسویں صدی میں برصغیر ہند میں بہت سی سیاسی، معاشی اور اقتصادی تبدیلیاں ظہور پذیر ہوئیں جن سے اردو ادب اور شاعری کا متاثر ہونا لازمی تھا۔ شاعری سوسائٹی کی تابع ہوتی ہے۔ اس لیے یہ ضروری تھا کہ صنفِ شاعری میں بھی تبدیلیاں رونما ہوں تا کہ وہ وقت کے اہم تقاضوں سے ہم آہنگ ہو سکے۔

جدید مرثیہ کی ابتداء: میر انیسؔ، مرزا دبیرؔ، نفیسؔ، اسیرؔ، مونسؔ، فارغؔ، وحیدؔ، عروجؔ، رشیدؔ، تعشقؔ، عارفؔ، فائقؔ، اوجؔ، اور دیگر مرثیہ گو شعراء کے بعد قدیم مرثیہ کی تکنیک میں اضافے کی گنجائش نظر نہیں آتی تھی اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ مرثیہ کا عہدِ زریں اختتام پذیر ہو گیا لیکن غمِ

---

[1] چہرہ، سراپا، رخصت، آمد، رجز، جنگ، شہادت، بین، اور بعد میں ساقی نامہ کا اضافہ ہوا

حسینؑ کو ہر حالت میں زندہ رہنا ہے اس لیے مرثیہ میں نئے فکری رجحانات کی تلاش ہوئی۔''

1927ء سے قبل جناب جوشؔ ملیح آبادی نے ''ذاکر سے خطاب'' اور ''سوگوارانِ حسینؑ سے خطاب'' لکھ کر نئے طرز کی مرثیہ نگاری کی داغ بیل ڈال دی تھی۔ 1939 میں لکھنؤ میں ''ایجی ٹیشن'' ہوا۔ اس کے پیشِ نظر مسلمانوں کے خوابیدہ جذبات کو بیدار کرنے بلکہ جھنجھوڑنے کی ضرورت پیش آئی اور ''بین المسلمین'' اتحاد کی بھی۔

شاعر، سوسائٹی کا نباض ہوتا ہے وہ بگڑتے ہوئے حالات کا جائزہ لے کر معاشرہ کی اصلاح کی طرف متوجہ ہوتا ہے۔ ایسی ہی کوششوں کے نتیجے میں 1939ء میں جناب سید آل رضا نے جدید طرز کا پہلا مرثیہ لکھا تھا جس کا عنوان تھا۔ ''شہادت سے پہلے'' اور مطلع حسبِ ذیل ہے:

''کلمہ حق کی ہے تحریر دلِ فطرت پر''

یہ مرثیہ لکھنؤ میں پڑھا گیا ہے جسے حاضرین نے بہت پسند کیا۔ اس مرثیے میں سید صاحب نے اپنی جدت طبع اور اختراع کا ثبوت دیا۔ فکر و نظر کے مختلف نظریے پیش کیے۔ مرثیے کی اخلاقی اقدار کو اجاگر کیا۔ یہ مرثیہ ''سنگ میل'' کی حیثیت رکھتا ہے۔

1940ء میں جناب جوشؔ نے ''حسین اور انقلاب'' کے عنوان سے ایک مسدس لکھا جس نے سامعین اور قارئین کو بہت متاثر کیا۔

1941ء میں ہندوستان کے مختلف شہروں میں سیزدہ صد سالہ یادگارِ حسینؑ منائی گئی۔ جلسوں میں مسلمانوں کے اتحاد اور رسول اکرمؐ کے نواسے امام حسینؑ کے اسوۂ حسنہ پر عمل پیرا ہونے کی ترغیب دی گئی۔

1944ء میں سید آلِ رضا صاحب کے جدید طرز کے دونوں مرثیے شائع ہوئے۔ ''شہادت سے پہلے'' اور ''شہادت کے بعد'' (جس کا مطلع تھا ''قافلہ آلِ محمدؐ کا سوئے شام چلا'' ان مرثیوں میں امامؑ عالی مقام کے ''پیام'' اور ان کی سیرت پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ جناب آلِ رضا کے ہم عصر جناب جمیلؔ مظہری، جناب نسیمؔ امروہوی، زائرؔ سیتاپوری مرحوم اور دوسرے مرثیہ گو شعراء نے بھی جدید طرز کے مرثیے کہے۔

حضرت نجم آفندی کے نوحوں میں تبلیغی رنگ پایا جاتا تھا۔ انھوں نے ''حسینی مشن'' کو آگے بڑھانے کی کوشش کی اور 1943ء میں نئے طرز کا مرثیہ کہا ''فتح مبین[1]'' اس کے پیش لفظ میں وہ یوں رقم طراز ہیں:

''میں نے بھی اس صنفِ میں قلم اٹھایا ہے۔ ایک مرثیہ پیش کر رہا ہوں جس میں اس بلند آہنگی شوکتِ الفاظ اور اظہارِ حقیقت کے ساتھ واقعہ کربلا جس کا مستحق ہے۔ مرثیت کے عنصر میں بھی کمی نہیں آنے پائی ہے۔''[2]

اس مرثیہ کا اجمالی خاکہ پیش کیا جا رہا ہے کہ اس کی افادیت کا علم ہو سکے

پہلا بند

جب لے لیا حسینؑ نے میدانِ کربلا　　بدلا لہو سے رنگِ بیابانِ کربلا
تھا وقتِ عصر اور ہی عنوانِ کربلا　　سوتا تھا فرشِ خاک پہ مہمانِ کربلا
بے سر تھا قتل گاہ میں لاشہ پڑا ہوا
بالیں پہ فتحِ حق کا تھا جھنڈا گڑا ہوا

پہلے ہی بند سے واقعہ نگاری کی ابتداء ہوتی ہے۔ امام حسینؑ نے جامِ شہادت نوش فرمایا بظاہر یہ ان کی شکست تھی لیکن دراصل یہ تو حق کی فتح تھی۔ ''لے لیا'' نے اسی مفہوم کی وضاحت کی ہے۔ امام حسینؑ کا سرِ اقدس نوک نیزہ پر فتح کا اعلان ہو رہا تھا۔ باطل کی شکست ہوئی اور یزید کا نام شامل دشنام ہوگیا۔

اس دن سے آج تک یہ حکومت کا زور ہے
ہر سمت یا حسینؑ[3] کا دنیا میں شور ہے

تیسرا بند ملاحظہ فرمائیے:

وہ حریت کو فخر وہ انسانیت کو ناز　　وہ رو بہ قبلہ دینِ پیمبرؐ کا چارہ ساز

---

[1] نجم آفندی فتح مبین مطبوعہ نظامی پریس لکھنؤ تعداد بند 64 بار اول 1943ء

[2] // // حوالہ بالا ص2

[3] انسان کو بیدار تو ہو لینے دو ہر قوم پکارے گی ہمارے ہیں حسینؑ (جوشؔ)

مقتل کی سرزمین کو وہ مولد سے امتیاز   چھائی ہوئی حسینؑ کی وہ آخری نماز

معراج آدمی کے قرار و شکیب کی

ہمدوشِ کہکشاں وہ بلندی نشیب کی

امام عالی مقام کے کارناموں پر انسانیت بجا طور پر فخر سے سربلند کر سکتی ہے۔ دینِ حق کی خاطر امام نے سر دے کر اسلام کا بھرم رکھ لیا۔لفظ چارہ ساز اس کی غمازی کر رہا ہے کہ یزید مذہب اسلام کو مٹانے کے درپے تھا۔ امام حسینؑ کا آخری سجدہ کتنی اہمیت کا حامل ہے۔ اس سجدے پر کون و مکان نثار، اسی سجدے کا یہ نتیجہ ہوا کہ اسلام بچ گیا۔ امام مظلوم نشیب میں تھے۔ خنجر اور گلو کا مرحلہ تھا۔نشیب سے تکبیر کی صدا آتے آتے بند ہو گئی۔ وہ سرزمین اس درجہ سرفراز ہوئی کہ اس کا فرق افتخار آسمان کی بلندیوں تک پہنچ گیا۔

پانچواں بند:

وہ شاندار موت وہ بنیادِ انقلاب   بیعت کا وہ سوال وہ دنداں شکن جواب

مجبوری حیات سے کونین کو حجاب   نیزہ پہ سر حسینؑ کا مغرب[1] میں آفتاب

صدقے ضیائے مہر و قمر آن بان پر

تارے درود پڑھتے ہوئے آسمان پر

رسول اکرم ﷺ کے نواسے امام حسینؑ نے جس طرح موت کا خیر مقدم کیا۔ دین حق کی خاطر ایک دن میں بہتر گلے کٹوائے۔ خالق کی راہ میں اپنا گھر بار لٹا دیا۔ اس کی مثال عالم کے کارخانے میں نہیں مل سکتی۔ اس قربانی کی وجہ سے سارے عالم میں امام علیہ السلام کی دھوم مچ گئی اور ان کی موت، حیاتِ جاوداں بن گئی۔ ایسی موت کو شاندار کہنا نہایت موزوں ہے۔ امام عالی مقام نے باطل کے سامنے سر نہ جھکایا۔ بیعت یزید سے انکار کر دیا۔

سر داد نہ داد دست در دستِ یزید

نتیجہ یہ ہوا کہ

زندہ حق از قوتِ شبیری است

باطل آخر داغ حسرت میری است

---

[1] سر اس طرف حسین کا نیزے پہ جلوہ گر   مغرب میں آفتاب ادھر ڈوبتا ہوا   (نجم)

امام مظلوم کے قتل کے بعد اس غضب کی آندھی اٹھی کہ الامان، سورج کو گہن لگ گیا۔ وہ اس خونیں منظر کی تاب نہ لا سکا کہ راکبِ دوشِ رسولؐ کا سر، نیزے پر ہو۔

''تفو بر تو اے چرخ گردوں تفو''

اس بند کا انداز بیان کس قدر دل کش ہے۔ بیت بار بار پڑھیے۔ آئینہ جمالِ رسالت، صابر و شاکر حسینؑ کس شام سے بغل گیر ہوا۔ اس آن بان پر چاند اور سورج کی چمک دمک صدقے۔ تارے آسمان پر درود پڑھیں تو تعجب کیسا۔

بعد قتل حسینؑ حشر کے آثار نمایاں ہو گئے لیکن

حدِ ادب پر صبح قیامت رُکی ہوئی
قدموں پہ عرش و فرش کی گردن جھکی ہوئی

آسمان سے صدا آئی تھی کہ یہ روز حشر ہے لیکن حکم خالق نہیں ہے اس لیے سوا نیزے پہ آفتاب نہیں آیا۔ ''حد ادب'' کا ٹکڑا معنویت سے بھرپور ہے۔

یہ مضمون جدید طرز کے مرثیوں کی خصوصیات کا متحمل نہیں ہو سکتا۔ صرف چند اشارے کیے جا سکتے ہیں۔ جدید طرز کے مرثیوں کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ انسان کو اخلاق حسنہ سکھائے۔ کائنات عالم کے لیے کربلا ایک ایسی درس گاہ ہے جس کا پیام ہر قوم کے لیے ہے اور ہر دور کے لیے ہے۔ سنیے:

نظمِ جہاں بدلنے کا عنوان مرحبا　　اسلام کی نجات کا سامان مرحبا
انساں صداقتوں کا نگہبان مرحبا　　بندہ خدا کی راہ میں بے جان مرحبا
اپنے اصول چھوڑ گیا غور کے لیے
اس کا پیام ایک ہے ہر دور کے لیے

پیام شبیریؑ حقیقت ابدی ہے کہ ''ذلت کی زندگی سے عزت کی موت بہتر ہے۔'' امام عالی مقام کے بہتر مجاہدین بھی اس پر عمل پیرا تھے۔

مذہب اسلام نے مساوات کا درس دیا، اس کا عملی ثبوت معرکہ کربلا میں بدرجہ اتم موجود ہے۔

بند۔ ۱:

عالم میں بے مثال ہے یہ کربلا کی جنگ　　یکساں وغا کی بندہ و آقا کو تھی اُمنگ
کچھ سن کا امتیاز نہ تفریقِ نسل و رنگ　　حق کی صلائے عام تھی میدان تھا نہ تنگ
ہر باوفا حسینؑ کے قدموں میں سوگیا
آقا کا خوں غلام کا خوں ایک ہوگیا

شہدا میں اٹھارہ بنی ہاشم تھے۔ باقی امام عالی مقام کے اصحاب و انصار جن میں حضرت جون بھی شامل تھے۔ ہم آہنگی کی و ہم رنگی مثال ملاحظہ فرمایئے۔ جس طرح علی اکبر کی میّت میدان سے اٹھا کر لائے، اُسی طرح حضرت جون کی بھی۔ اللہ رے جوش وولولۂ جنگ۔

اس معرکہ کی ایک خصوصیت یہ بھی تھی کہ ذرا ذرا سے بچے بھی سپاہی کا کردار ادا کررہے تھے۔ ایک بے شیر بے زبان مجاہد نے[1] **ھل من ناصر ینصرنا ھل من مغیث یغثنا** کی صدا سن کر اپنے آپ کو گہوارے سے گرادیا۔ جب امام عالی مقام خیمے میں تشریف لائے تو حضرت علی اصغرؑ ہمک کر ان کی گود میں چلے گئے۔ اتمامِ حجت کے لیے امام حسینؑ اس ننھے مجاہد کو میدانِ کارزار میں لے گئے۔ حضرت علی اصغرؑ نے سوکھی زبان ہونٹوں پر پھیری۔ **اقطع کلام الحسین**[2] کا حکم ملتے ہی حرملہ نے تیر پھینکا جس سے حضرت علی اصغرؑ کا ننھا سا گلا چھد گیا۔ باپ کی گود میں ننھا ڈھلک گیا:

جانِ رباب و جانِ پدر جانِ کربلا
چھ ماہ کا وہ فاتحِ[3] میدانِ کربلا

بند ۱۶ سے بند ۱۸ تک اسی بے زبان شہادت کا ذکر ہے۔ ''جس کا جھولا خالی ہے'' اس میں بلا شک وشبہ کی کیا گنجائش کہ:

---

[1] امام حسینؑ کی آواز استغاثہ کائنات میں گونج گئی۔ ہے کوئی جو میری نصرت کرے۔ کوئی میری آواز استغاثہ پر لبیک کہنے والا ہے۔

[2] حسینؑ کے کلام کو قطع کردو۔ امام مظلوم، بے زباں کے لیے پانی مانگ رہے تھے۔ اسی کی طرف اشارہ ہے

[3] تہذیب لاشِ اصغرؑ ناداں پہ نوحہ گر　اخلاق کی نگاہ سے عالم گرا ہوا　(نجم)

بند: ۱۸

تاریخ جس کے قتل کی لائی نہیں مثال　　پانی کے مانگنے پر ہو گرتا لہو میں لال
اس زخمِ دل کا بھی کہیں ممکن ہے اندمال　　وہ دردناک موت کہ تفصیل ہے محال
سجادؑ جن کے صبر کی کچھ انتہا نہیں
پوچھیں کہ شیر خوار کا قاتل ملا نہیں

بند ۱۹ سے بند ۲۵ تک شہزادہ علی اکبرؑ ہم شبیہہ پیغمبرؐ کا تذکرہ ہے۔ حسبِ ذیل بند میں اس روایت کی طرف اشارہ ہے کہ شبِ عاشور جب حضرت علی اکبرؑ خیمے میں سو رہے تھے تو ان کی والدہ ماجدہ حضرت ام لیلیٰ شمع جلا کر اپنے یوسفِ کنعاں کا چہرہ دیکھتی رہیں۔ دل کی دھڑکنیں کہہ رہی تھیں کہ یہ آج رات کا اور مہمان ہے کل اس کی قربانی پیش کی جائے گی۔

بند: ۲۰

وہ عزم و اختیار و قدرت کہ الاماں　　وقتِ اجل قریب تھا ایک شب تھی درمیاں
کیا مطمئن خیام میں سویا یہ نوجواں　　تصویرِ درد ہے شبِ عاشور کا سماں
دل سے لگی تھی شکلِ پسر دیکھتی رہی
ماں شمع لے کے تا بہ سحر دیکھتی رہی

ماں کی مامتا اور فرض شناسی کے جذبے میں تصادم۔ دل پہ یہ اختیار کہ اپنے لال کو دولھا بنا کر میدانِ کارزار میں بھیج دیا۔ اس سلسلہ کا آخری بند بھی سن لیجیے:

بند: ۲۴

دنیا میں یادگار ہے اس شیر کا جہاد　　یہ حال تھا کہ جیسے بر آئی دلی مراد
مقصودِ زندگی نے کیا جب اجل کو یاد　　آئی فضائے دشت سے آواز زندہ باد
توڑا پدر کی گود میں دم نورِ عین نے
تنہا تھے خود ہی لاش[1] اٹھائی حسینؑ نے

بند ۲۶ سے بند ۳۰ تک حضرت قاسم بن حسنؑ کی معرکہ آرائی کا بیان ہے۔ وہ بھی اس

---

[1] یہ ضعف اور یہ لاشہ جوان بیٹے کا　　یہ تیرے دوش پہ کوہِ وقار کیا کہنا　(نجم)

اصول پر عمل پیرا تھے کہ جان جائے لیکن اسلام کی آن بان پر آنچ نہ آنے پائے۔

بند: ۲۷

یہ نوجواں تھے جن کی جوانی کو آفریں تعمیرِ قوم کرتے ہیں ایسے ہی خوش یقیں
اسلام کی حیات تھی مقصودِ اولیں دھڑکا یہ تھا اصول کو جنبش نہ ہو کہیں

شایانِ حرزِ جاں نہ تھے تیور دلیر کے
تعویذ حسبِ مرگ تھا بازو[1] پہ شیر کے

حضرت قاسمؑ کی لاش پامالِ سمِ اسپاں ہوگئی۔ اور لاش کے ٹکڑے چادر میں لپیٹ کر خیمے میں پہنچائے گئے۔

مادر کے صبر وضبط کا ممکن نہیں جواب

بند ۳۱ تا ۳۴ حضرت زینبؑ کے دونوں صاحبزادوں (عونؑ و محمدؑ) کی جنگ اور شہادت کا حال بیان کیا گیا ہے۔

حضرت زینبؑ نے اپنے بچوں کو دولھا بنا کر میدانِ کارزار میں بھیجا تھا:

نزدیک آرہے تھے جوانی کے صبح و شام جینے سے منہ پھرائے تھے لیکن یہ لالہ فام
طرزِ ادا کس قدر پُرکشش ہے۔ دونوں کا بچپن تھا ابھی مسیں بھی نہ بھیگی تھیں۔

بند: ۳۴

دم بھر کیا نہ موت کی منزل میں پیش پس تیغیں چھٹیں نہ ہاتھ سے جب تک تھا دسترس
کیا زندگی دلوں میں تھی کیا بازوؤں میں کس کیسے متاعِ فخر تھے وہ آخری نفس

جن میں فقط حسینؑ کی خدمت کا جوش تھا
جینے کی آرزو تھی نہ مرنے کا ہوش تھا

آقا کی خدمت اور اطاعت گزاری کی لگن ہو تو ایسی ہو۔

---

[1] حضرت امام حسینؑ کسی طرح حضرت قاسمؑ کو میدان جنگ کی اجازت دینے پہ تیار نہ تھے۔ اس وقت حضرت قاسمؑ نے اپنے بازو پہ جو تعویذ بندھا تھا، اسے کھولا جس میں امام حسنؑ کی وصیت تحریر تھی۔ اس طرح حضرت قاسمؑ کو اجازت ملی۔

بند ۳۵ سے ۳۷ تک حضرت مسلم کے دونوں صاحبزادوں کی شہادت کا بیان ہے۔ امام مظلوم کی خاطر دونوں نے اپنے گلے کٹوا دیے۔ ان منچلوں کی جنگ بھی یادگار تھی۔

بند: ۳۷

وہ حسنِ بے پناہ وہ اٹھتی جوانیاں جن کا بیاں کر نہ سکیں خوش بیانیاں
مظلوم ایلچی کی وہ مٹتی نشانیاں اب تک ہیں مرثیہ کی زباں میں کہانیاں
یہ نوجواں آپ ہی اپنی مثال ہیں
اسلام کا غرور ہیں مسلمؑ کے لال ہیں

اگلے بند میں تجمم آفندی نے کربلا کے ہر شہید کو خراج عقیدت پیش کیا ہے۔ ہر ایک مجاہد کی ادائے شہادت دل نشیں تھی۔ عالم اسباب ایسی نظر پیش کرنے سے قاصر ہے۔ بیت ملاحظہ ہو۔

کیا جانے کیسے ارض و سما تھے ٹکے ہوئے
اللہ ایک دن میں یہ سب معرکے ہوئے

عاشور کے دن نبرد کا میدان لہو سے لال ہو گیا تھا اور رہ رہ کر ہنگامۂ قتال گرم ہوتا تھا۔ امام مظلوم کے دل پر بہتر داغ تھے۔ ہجوم کرب میں وہ عزم و ثبات۔ یک ہزار پنجاہ زخم جسمِ اقدس پر۔ امامؑ کا سوکھا گلا اور شمر کا خنجر۔ شاعر متحیر اور ششدر ہے کہ زمین و آسمان ایسے خونیں مناظر کی تاب کیسے لا سکے۔ دفترِ عالم کا ورق الٹ کیوں نہیں گیا۔ لفظ ''اللہ'' میں فریاد بھی ہے اور رضائے الٰہی کا تصور بھی۔

بند ۳۹ سے بند ۴۰ تک قمرِ بنی ہاشم حضرت عباسؑ کی چند صفات کا تذکرہ ہے۔ اس عہد کے علمی کی معرکہ آرائی کا اختصار سے بیان ہے۔ ان کے دل میں ولولۂ کارزار تھا۔ بے ساختہ لجامِ فرس فرات کی جانب اٹھ گئی۔ لڑتے ہوئے ترائی میں پہنچ گئے۔ زمین کانپنے لگی اور سرکشوں کے سر برسنے لگے۔ تاوسعتِ نظر لاشے ہی لاشے دکھائی دیتے تھے۔ حشر کے سامان آشکار تھے۔ مشک سکینہؑ بھر لی لیکن خود پیاسے رہے۔ خیمے کی طرف بڑھتے ہوئے جا رہے تھے کہ نرغہ اعداء میں گھر گئے اور دونوں شانے قلم ہو گئے۔ اس مفہوم کو شاعر نے حسب ذیل بیت میں کس عمدگی سے ادا کیا ہے:

چرچے بہادروں میں ہیں اس جاں نثار کے
بازو دیے ہیں مشک پہ صدقے اتار کے

بند:۴۳

اشرار سے نگاہ ملاتا ہوا چلا تیروں کی زد سے مشک بچاتا ہوا چلا
پانی سا اپنا خون بہاتا ہوا چلا تلواریں جھوم جھوم کے کھاتا ہوا چلا
سو زخم کھائے اور غش کھا کے گر پڑا
آیا جو تیر مشک پہ تیورا کے گر پڑا

حضرت عباسؑ کی آرزو تھی کہ خیام اہل بیت تک پانی پہنچا دیا جائے۔سکینہؑ سے پانی لانے کا وعدہ کیا تھا لیکن وہ ایفا نہ ہوسکا۔اس لیے منہ چھپائے ہوئے ریتی پر پڑے ہوئے ہیں [1]

اسد اللہ کا لال ہو بہو، اسد اللہ ہے اور

بند:۴۴

یہ شیر ہے دیارِ جلالت کا حکمراں ملّت کے نوجوان دلوں کا نگاہباں
صدیوں سے اس کے نام پہ عاشق ہیں نوجواں ہر ایک جانتا ہے اسے میرِ کارواں
سینوں میں دل تڑپتے ہیں تسلیم کے لیے
جھکتے ہیں سر نشان کی تعظیم کے لیے

حضرت عباسؑ علم دارِ لشکر ہمت و جرأت کا پیکر تھے۔صداقت کے پیامبر تھے۔نشان فوج پیمبر کی سلامی کے لیے حریت بھی خم ہوتی ہے۔

بند۴۶ سے بند۵۱ تک حضرت عبداللہ بن حسنؑ کی شہادت کا لرزہ خیز بیان ہے۔عصر کے وقت جب امام مظلوم زخموں کی تاب نہ لا سکے اور زین فرس سے خاک پر تشریف لائے، اس وقت گیتی کو زلزلہ ہوا۔حضرت عبداللہ نے درِ خیمہ سے دیکھا کہ امام پر نیزوں اور تلواروں کے وار ہو رہے تھے۔بچہ اس منظر کی تاب نہ لا سکا اور دوڑتا ہوا امامؑ کے پاس پہنچ گیا۔

---

[1] کتا کے ہاتھ ترائی میں سو گئے عباسؑ علم حسینؑ کے خیمہ میں لایا جاتا ہے (نجم)

بند: ۴۹

دو دن کی بھوک پیاس میں یہ ہوش یہ حواس　　یہ فرض کا شعور محبت کی یہ اساس
جب عزم مستقل ہو تو کیا خوف کیا ہراس　　خطروں کو روندتا ہوا پہنچا یہ حق شناس
ہاتھوں نے بڑھ کے گرمیِ رفتار روک لی
آتی ہوئی حسین پہ تلوار روک لی

اللہ اللہ کم سن بچے میں فرض شناسی کا یہ جذبہ۔ ایثار وقربانی ایسے ہی جذبوں سے سرشار افرادقوم، کا رہائے نمایاں انجام دے سکتے ہیں۔ واقعات کربلا ہماری زندگی کا مکمل نظام پیش کرتے ہیں۔ اس لیے افرادقوم کو اخلاقی اقدار کو اپنانے کی کوشش کرنی چاہیے تاکہ تعمیری کاموں میں وہ بڑھ چڑھ کر حصہ لے سکیں۔

بند: ۵۴

اس یادگار صبح کی وہ یادگار شام　　وہ قتل گہ کے سامنے جلتے ہوئے خیام
میدان میں حسین کے اہلِ حرم تمام　　بچوں کی عورتوں کی اسیری کا اہتمام
بازو بھی ریسمان بھی طوق اور گلو بھی تھا
کامل تھا ظلم آگ بھی تھی اور لہو بھی تھا

بین

ابتدائی دور میں دکن میں جو مرثیے لکھے گئے ان کا مقصد ہی رونا رلانا تھا۔ شمالی ہند میں جب اس صنف نے ترقی کی تو مرثیے کی ہیئت اور تکنیک میں بین کو مرثیہ کا اہم جزو قرار دیا گیا۔ جدید طرز کے مرثیہ کو حضرات نے مروجہ تکنیک کو خیر باد کہہ کے مرثیے میں نئے نئے گوشے تلاش کیے اور مرثیے کے لیے نئے نئے موضوع منتخب کیے لیکن یہ بھی کہا کہ:

''خوش نشانی بھی ہے لازم اشک افشانی کے ساتھ''

بالفاظ دیگر بین کے عنصر کو نظر انداز نہیں کیا گیا۔

نجم آفندی نے شام غریباں کی ایسی تصویر پیش کی ہے جس کے نقوش آج بھی ابھرے ہوئے نظر آرہے ہیں اور وہ ''مصور غم'' کہے جانے کے بجا طور پر مستحق ہیں۔

نجم نے ''فتح مبین'' میں لوچدار زبان اور درد بھرے لہجے میں شہیدان راہ حق کی مدح کی۔ ان کے پیام امن و آشتی اور اصول پرستی کو عام کیا۔ افراد قوم کو ان کے اسوۂ حسنہ پر عمل پیرا ہونے کی تعلیم دی۔ انھیں جرأت، محبت اور شجاعت کا درس دیا اور ببانگ دہل اس کا اعلان کیا کہ حسینیوں کی ہدایت کے لیے ''شہادت عظمیٰ'' مشعل ہدایت ہے اور اس مادی دنیا کے حسن و جمال پر وہ فریفتہ نہیں ہوتے بلکہ ان کا مطمح نظر ہے ''عزت کی زندگانی'' باطل کے سامنے سر تسلیم خم نہ کرنا اور سچے اصولوں کی خاطر کسی قربانی سے دریغ نہ کرنا۔

امام عالی مقام نے صرف میدان کربلا ہی نہیں لے لیا بلکہ کائنات کے ذرے ذرے کو مسخر کرلیا۔ حسینیت کے دامن میں آنے کے لیے نہ تو نسل و رنگ کی قید ہے اور نہ ذات پات کی بلکہ کربلا کے معین کردہ اخلاقی اقدار کو اپنانے کی اور حسینی مجاہدین کی سیرت پر عمل کرنے کی۔

عظیم شاعر نجم آفندی آج ہم میں نہیں ہیں لیکن انھیں اہل بیت علیہ السلام سے عشق تھا، لہٰذا ہم یہ کہنے میں حق بجانب ہیں کہ

''ہر گز نمیرد آں کہ دلش زندہ شد بہ عشق۔

○

مرثیہ

فتحِ مبین

ع : جب لے لیا حسینؑ نے میدانِ کربلا!

64 بند

تصنیف 1943ء

فتحِ مبین

(1)

جب لے لیا حسینؑ نے میدانِ کربلا
بدلا لہو سے رنگِ بیابانِ کربلا
تھا وقتِ عصر اور ہی عنوانِ کربلا
سوتا تھا فرشِ خاک پہ مہمانِ کربلا
بے سر تھا قتل گاہ میں لاشہ پڑا ہوا
بالیں پہ فتحِ حق کا تھا جھنڈا گڑا ہوا

(2)

ریتی کی سجدہ گاہ پہ خونِ پیمبری
ڈوبی ہوئی لہو میں قبائے غضنفری
کون و مکاں میں رعبِ شہادت سے تھرتھری
ایسی سکندری تھی کسی کی نہ قیصری
اس دن سے آج تک یہ حکومت کا زور ہے
ہر سمت یا حسینؑ کا دنیا میں شور ہے

(3)

وہ حریتؔ کو فخر وہ انسانیت کو ناز
وہ رو بقبلہ دینِ پیمبرؐ کا چارہ ساز
مقتل کی سر زمیں کو وہ مولد سے امتیاز
چھائی ہوئی حسینؑ کی وہ آخری نماز
معراج آدمی کے قرار و شکیب کی
ہمدوش کہکشاں وہ بلندی نشیب کی

(4)

وہ شاندار موت وہ بنیادِ انقلاب
بیعت کا وہ سوال وہ دنداں شکن جواب
مجبوریِ حیات سے کونین کو حجاب
نیزہ پر سر حسینؑ کا مغرب میں آفتاب

صدقے ضیائے مہر و قمر آن بان پر
تارے درود پڑھتے ہوئے آسمان پر

(5)

قدسی مقامِ عرض پہ باندھے ہوئے پَرا
پیشِ نگاہ مجمعِ ارواحِ انبیاؑ
ہیبت سے زلزلہ میں ادب گاہِ کربلا
ہر سمت سے ارادتِ کونین رونما

طوفانِ بحر و بر میں عناصر لیے ہوئے
سب امتثالِ امر میں سر خم کیے ہوئے

(6)

وہ خون میں رنگے ہوئے گیسوئے تابدار
وہ خاک میں اٹا ہوا زہراؑ کا گل عذار
دونوں طرح حقیقتِ اسلام اُستوار
قرآن اس کے سینہ میں پہلو میں ذوالفقار

حدِ ادب پہ صبح قیامت رُکی ہوئی
قدموں میں عرش و فرش کی گردن جھکی ہوئی

(7)

نظمِ جہاں بدلنے کا عنوان مرحبا
اسلام کی نجات کا سامان مرحبا
انساں صداقتوں کا نگہبان مرحبا
بندہ خدا کی راہ میں بے جان مرحبا

اپنے اصول چھوڑ گیا غور کے لیے
اُس کا پیام ایک ہے ہر دور کے لیے

(8)

اس کے پیام اُس کی امانت کو آفریں
سوکھے لبوں پہ حرفِ حقیقت کو آفریں
اُس دل کو دل میں صبر کی قدرت کو آفریں
جسمِ بشر میں روحِ شرافت کو آفریں

اُس پر سلام پیاس کے صدمے جو سہہ گیا
کہنے کی بات حلقِ بریدہ سے کہہ گیا

(9)

کیا بات اُس کی جو ہو شہیدوں میں سربلند
سلطانِ کائنات کا فرزندِ ارجمند
تنہا نہ تھا وہ اپنے ارادوں پہ کاربند
عزت کی موت اس کے غلاموں نے کی پسند

اُس کے بھی تھے شریک وہ کم تھے کہ بیش تھے
ہاتھوں پہ سر لیے ہوئے سب پیش پیش تھے

(10)

عالم میں بے مثال ہے یہ کربلا کی جنگ
یکساں وغا کی بندہ و آقا کو تھی اُمنگ
کچھ سن کا امتیاز نہ تفریق نسل و رنگ
حق کی صلائے عام تھی میدان تھا نہ تنگ

ہر باوفا حسینؑ کے قدموں میں سوگیا
آقا کا خوں غلام کا خوں ایک ہوگیا

(11)

وہ اِرد گرد پیکرِ انصارِ باوفا
دریا تلک غریب کے فِدیوں کا سلسلہ
ہر عہد میں ہیں ذکر کے قابل وہ باوفا
چھوٹے بڑے سب ایک ہی منزل کے رہنما

بعدِ فنا بھی جوشِ وغا میں تنے ہوئے
بچے ذرا ذرا سے سپاہی بنے ہوئے

(12)

جانیں نثار کی ہیں کہ اللہ کی پناہ
کیا کارواں تھا جس کی یہ دنیا ہے گردِ راہ
حیراں ہیں اب بھی قطع منازل پہ مہر و ماہ
پڑتی ہے ہر مفکر و خوش فکر کی نگاہ

انسانیت کا نور تھے ظلمت کے واسطے
لاشیں تھیں زندگی کی ہدایت کے واسطے

(13)

سب سے قریب خاک میں اک نعشِ خوں چکاں
وہ امتیاز دولتِ سالارِ کارواں
اسلام کا مجاہدِ بے شیر و بے زباں
پہنے ہوئے بلّور سی گردن میں ہنسلیاں

جانِ رباب جانِ پدر جانِ کربلا
چھ ماہ کا وہ فاتحِ میدانِ کربلا

(14)

جھولے سے گر کے جس کو یہ حاصل ہوا مقام
لکھا ہے کربلا کی بلندی پہ جس کا نام
جس کے زباں دکھانے پہ حجت ہوئی تمام
بچہ کہ جس کو حجّتِ آخر کریں سلام

وا جس کے اشتیاق میں ہر ماں کی گود ہے
گہوارہ جس کا آج مسلماں کی گود ہے

(15)

اس طفلِ شیر خوار کی ہے داستاں عجیب
کب تیر جاں ستاں کا نشانہ ہوا غریب
جب گود میں پدر کی رگِ دل سے تھا قریب
پانی کی جستجو میں شہادت ہوئی نصیب

سب کا جو لاڈلا تھا حسینیؑ سپاہ میں
خیمہ سے ہاتھوں ہاتھ گیا رزم گاہ میں

(16)

اکبرؑ کے بعد موت کی گودی میں جو گیا
بے دودھ نیند آ گئی پیاسا ہی سوگیا
دنیا میں جس کا نام ہی بے شیر ہوگیا
وہ چاند فوجِ شام کی بدلی میں کھوگیا

سورج ہزار اُس پہ تصدّق ہزار چاند
جس نے لگائے باپ کی محنت میں چار چاند

(17)

نورِ نظر کی شان سے جو چشمِ نم میں ہے
یہ کائنات ماں کی طرح جس کے غم میں ہے
گھر گھر میں جس کا ذکر ٹھکانا اِرم میں ہے
نوحہ عرب میں جس کا ہے ماتم عجم میں ہے

مہماں پرست ہند کے اک اک دیار میں
جھولا ہے جس کا آج تلک انتظار میں

(18)

تاریخ جس کے قتل کی لائی نہیں مثال
پانی کے مانگنے پہ ہو گرتا لہو میں لال
اِس زخمِ دل کا بھی کہیں ممکن ہے اندمال
وہ درد ناک موت کہ تفصیل ہے محال

سجادؑ جن کے صبر کی کچھ انتہا نہیں
پوچھیں کہ شیر خوار کا قاتل ملا نہیں

(19)

نزدیک خوابِ مرگ میں اک اور لاڈلا
شہزادیٔ حجاز کی آغوش میں پلا
آلودہ خاک و خوں میں جوانی کا ولولا
ہم صورتِ رسولؐ پہ تقدیرِ کربلا
وہ عکس بے مثال نبیؐ کے جمال کا
پورا جوان بھی نہیں اٹھارہ سال کا

(20)

وہ عزم و اختیار وہ قدرت کہ الاماں
وقتِ اجل قریب تھا اک شب تھی درمیاں
کیا مطمئن خیام میں سویا یہ نوجواں
تصویرِ درد ہے شبِ عاشور کا سماں
دل سے لگی تھی شکلِ پسر دیکھتی رہی
ماں شمع لے کے تا بہ سحر دیکھتی رہی

(21)

انگڑائی لے کے صبح جو اٹھا یہ لالہ فام
حالاتِ زندگی نے دیا موت کا پیام
اُس ماں کو نونہالوں کا اسلام کے سلام
اِک وہ بھی چاہِ پیار تھا اک یہ بھی اہتمام
انسانیت کی حق کی صداقت کی راہ میں
دولھا بنا کے بھیج دیا قتل گاہ میں

(22)

جذبہ تو دیکھیے اُسی بی بی کا تھا جگر
اس شوق میں کھڑی رہی آکر قریبِ در
لڑتا ہے کس طرح سے مرا نوجواں پسر
پردے کی آڑ سے رُخِ سرور پہ تھی نظر
آقا تھے خوش پسر کی شجاعت کو دیکھ کر
یہ مطمئن حسینؑ کی صورت کو دیکھ کر

(23)

سینہ پہ نونہال کے برچھی لگی ہے جب
گھوڑے سے جب زمیں پہ گرا ہے یہ تشنہ لب
ہر چند امرِ صبر پہ مامور تھے یہ سب
آنکھوں میں آگئے ہوں جو آنسو تو کیا عجب
احساسِ مادری سے محلِ بَیر کا نہ تھا
آخر تو ماں کا دل تھا کسی غیر کا نہ تھا

(24)

دنیا میں یادگار ہے اس شیر کا جہاد
یہ حال تھا کہ جیسے بر آئے دلی مراد
مقصودِ زندگی نے کیا جب اجل کو یاد
آئی فضائے دشت سے آواز زندہ باد
توڑا پدر کی گود میں دم نورِ عین نے
تنہا تھے خود ہی لاش اٹھائی حسینؑ نے

(25)

ہم نام تھا علیؑ کا شجاعت تھی فرشِ راہ
اُس سے بڑے بڑوں نے ملائی نہیں نگاہ
یہ نوجوانِ قوم ہیں سب اکبری سپاہ
کلمہ اسی کے نام کا پڑھتے ہیں کج کلاہ
تاریخ کی بلند نگاہوں میں فرد ہے
بچہ یہ خاندانِ رسالتؐ کا مرد ہے

(26)

زخموں سے چور بحرِ شجاعت کا اک نہنگ
مرنے کی جس کے دل میں سویرے سے تھی امنگ
چہرہ کا شوقِ جنگ میں نکھرا ہوا تھا رنگ
مولاؑ نے کی اجازتِ میداں میں کچھ درنگ
قسمت نے دی صدا وہ رُکے گا نہ آپ سے
اذنِ وغا ملے جسے ورثہ میں باپ سے

(27)

یہ نوجواں تھے جن کے جوانی کو آفریں
تعمیرِ قوم کرتے ہیں ایسے ہی خوش یقیں
اسلام کی حیات تھی مقصودِ اوّلیں
دھڑکا یہ تھا اُصول کو جنبش نہ ہو کہیں
شایانِ حرزِ جاں نہ تھے تیور دلیر کے
تعویذ حُبِّ مرگ تھا بازو پہ شیر کے

(28)

ایسا لڑا کہ قوم میں ہے وجہ افتخار
گھوڑے سے جب گرا ہے یہ ہنگامِ کارزار
دشمن نے جسمِ زار پہ دوڑا دیے سوار
پامالِ انتقام ہُوا یہ وفا شعار
یہ حال تھا چچا کی نہ گودی میں آسکا
لاشہ بھی من چلے کا نہ خیمہ میں جاسکا

(29)

بیوہ کا لال تھا یہ طرحدار و شعلہ خو
کم سِن مگر قریب تھا ہنگامِ رنگ وبو
امکان ہے کہ ماں کو ہو شادی کی آرزو
اِس آرزو کی رہ گئی دنیا میں آبرو
تقدیر نے بہار سراپا بنا دیا
قدرت خدا کی موت نے دولھا بنادیا

(30)

پامال ہو رہا تھا پسر کا اِدھر شباب
بابا اُدھر بقیع کی جنت میں محوِ خواب
کیا جانیے لحد کو سکوں تھا کہ اضطراب
مادر کے صبر و ضبط کا ممکن نہیں جواب
گھر بھر کو شوقِ دید تھا کیسی لڑائی تھی
ڈیوڑھی پہ اُن کی پالنے والی بھی آئی تھی

(31)

یکجا تھے دو حسینؑ کے کم عمر جاں نثار
ہمت پہ جن کی دیکھنے والوں کو آئے پیار
یہ جعفری تھے ثانیِ زہراؑ کے گلِ عذار
چھوٹا تھا مرتے دم بھی بڑے کے گلے کا ہار
کپڑے بدل کے دوش پہ زلفیں سنوار کے
بھیجا تھا ماں نے بھائی کے بچوں پہ وار کے

(32)

نزدیک آ رہے تھے جوانی کے صبح و شام
جینے سے منہ پھرائے تھے لیکن یہ لالہ فام
بچوں میں تھے مگر ہے جوانوں سے بڑھ کے نام
کیا کیا ہوئے تھے برچھیاں کھانے کے انتظام
مادر نے سب بزرگوں کے تیور بتائے تھے
شب بھر بہادری کے فسانے سنائے تھے

(33)

کس کو نصیب ہوتی ہے یہ منزلِ وفا
پیشِ نظر تھی تشنگیِ شاہِ کربلا
سنتے ہیں علقمہ کی طرف رُخ نہیں کیا
مشہور ہے کہ ماں کا اشارہ بھی اس میں تھا
پیاسے تھے تین دن کے مگر کیا غیور تھے
لاشے بھی شاہزادوں کے دریا سے دور تھے

(31)

یکجا تھے دو حسینؑ کے کم عمر جاں نثار
ہمت پہ جن کی دیکھنے والوں کو آئے پیار
یہ جعفری تھے ثانیِ زہراؑ کے گلِ عذار
چھوٹا تھا مرتے دم بھی بڑے کے گلے کا ہار

کپڑے بدل کے دوش پہ زلفیں سنوار کے
بھیجا تھا ماں نے بھائی کے بچوں پہ وار کے

(32)

نزدیک آ رہے تھے جوانی کے صبح و شام
جینے سے منہ پھرائے تھے لیکن یہ لالہ فام
بچوں میں تھے مگر ہے جوانوں سے بڑھ کے نام
کیا کیا ہوئے تھے برچھیاں کھانے کے انتظام

مادر نے سب بزرگوں کے تیور بتائے تھے
شب بھر بہادری کے فسانے سنائے تھے

(33)

کس کو نصیب ہوتی ہے یہ منزلِ وفا
پیشِ نظر تھی تشنگیِ شاہِ کربلا
سنتے ہیں علقمہ کی طرف رُخ نہیں کیا
مشہور ہے کہ ماں کا اشارہ بھی اس میں تھا

پیاسے تھے تین دن کے مگر کیا غیور تھے
لاشے بھی شاہزادوں کے دریا سے دور تھے

(37)

وہ حُسنِ بے پناہ، وہ اٹھتی جوانیاں
جن کا بیان کر نہ سکیں خوش بیانیاں
مظلوم ایلچی کی وہ مٹتی نشانیاں
اب تک ہیں مرثیہ کی زباں میں کہانیاں

یہ نوجوان آپ ہی اپنی مثال ہیں
اسلام کا غرور ہیں مسلم کے لال ہیں

(38)

کیا ایک نوجوان تھا کیا ایک مہ جبیں
مسلح تھی اہل بیتِ رسالت کی یہ زمیں
ایک ایک کی ادائے شہادت تھی دل نشیں
جن کی نظیر عالمِ اسباب میں نہیں

کیا جانے کیسے ارض و سما تھے تکے ہوئے
اللہ ایک دن میں یہ سب معرکے ہوئے

(39)

بچّوں کے گھر میں تشنہ دہانی کا معرکہ
سقّہ کے خوں فرات کے پانی کا معرکہ
شمشیرِ ہاشمی کی روانی کا معرکہ
اس عہد کے علیؑ کی جوانی کا معرکہ

تنہا تمام نہر پہ قبضہ کیے ہوئے
دل کے قریب مشکِ سکینہؑ لیے ہوئے

(40)

ٹکرا رہا تھا موت سے کیا آن بان تھی
بھر پُور تھا شباب تو ہمّت جوان تھی
خیمہ کا رُخ تھا مشکِ سکینہؑ میں جان تھی
دو دن کی تشنگی پہ وفا کی یہ شان تھی
آتی تھی مرحبا کی صدا شش جہات سے
پیاسا پلٹ رہا تھا بہادر فرات سے

(41)

وہ دل کا جوش رُخ سے نمودار الاماں
دنیا کی جان لینے پہ تیار الاماں
حق کی سپر حسینؑ کی تلوار الاماں
بچوں سے پانی لانے کا اقرار الاماں
چرچے بہادروں میں ہیں اس جاں نثار کے
بازو دیے ہیں مشک پہ صدقے اُتار کے

(42)

بے دست ہوگیا تو ملی شانِ جعفری
تھی ہمہمہ سے لشکرِ دشمن میں ابتری
دریائے خوں میں ہائے وہ اُس کی شناوری
خیمہ کا رخ کیے ہوئے بڑھتا رہا جری
دو ٹھوکروں میں فوج کا طوفاں سرک گیا
دانتوں میں مشک لے کے بڑی دور تک گیا

(43)

اشرار سے نگاہ ملاتا ہوا چلا
تیروں کی زد سے مشک بچاتا ہوا چلا
پانی سا اپنا خون بہاتا ہوا چلا
تلواریں جھوم جھوم کے کھاتا ہوا چلا
سو زخم کھائے اور نہ غش کھاکے گر پڑا
آیا جو تیر مشک پہ تیورا کے گر پڑا

(44)

یہ شیر ہے دیارِ جلالت کا حکمراں
ملت کے نوجوان دلوں کا نگاہباں
صدیوں سے اُس کے نام پہ عاشق ہیں نوجواں
ہر ایک جانتا ہے اُسے میرِ کارواں
سینوں میں دل تڑپتے ہیں تسلیم کے لیے
جھکتے ہیں سر نشان کی تعظیم کے لیے

(45)

اُس ماں کا لال تھا یہ جواں مرگ پُرجگر
پہنچی ہے کربلا سے مدینہ میں جب خبر
مسجد میں کہہ رہا تھا یہ قاصد بچشم تر
کس بے کسی میں قتل ہوئے شاہِ بحر و بر
دشمن تھے سب رفیق کوئی پاس تھا کہاں
بولی تڑپ کے ماں مرا عباس تھا کہاں

(46)

ڈوبا ہوا لہو میں تھا ایک اور نونہال
صدقے ہو جس پہ حُسن بھی وہ صاحبِ جمال
اصغرؑ کے بعد سارے شہیدوں میں خرد سال
جو وقتِ عصر آ کے ہوا تھا شریکِ حال

بے دست بازوئے شہِ دلگیر کی طرح
پیکاں گلوئے خشک میں بے شیر کی طرح

(47)

جب جھومتے تھے خاک پہ بیٹھے ہوئے حسینؑ
گیتی کو زلزلہ تھا لرزتے تھے مشرقین
موجیں اب فرات سے جب کر رہی تھیں بین
حاضر تھا خیمہ گاہ کے در پر یہ نورِ عین

تڑپا یہ حالِ سیّدِ ابرار دیکھ کر
نیزوں کے وار تیروں کی بوچھار دیکھ کر

(48)

اس کم سِنی میں ٹھاٹھ بدلنے کو دیکھیے
آنکھوں سے دردِ دل کے اُبلنے کو دیکھیے
تیغوں میں برچھیوں میں نکلنے کو دیکھیے
مادر کے روکنے پہ مچلنے کو دیکھیے

رہبر پہ جان دینے کو راہی نکل گیا
ماں دیکھتی رہی یہ سپاہی نکل گیا

(49)

دو دن کی بھوک پیاس میں یہ ہوش یہ حواس
یہ فرض کا شعور محبت کا یہ اساس
جب عزم مستقل ہو تو کیا خوف کیا ہراس
خطروں کو روندتا ہوا پہنچا یہ حق شناس
ہاتھوں نے بڑھ کے گرمیِ رفتار روک لی
آتی ہوئی حسینؑ پہ تلوار روک لی

(50)

یہ بندگانِ ظلم سے زور آزمائیاں
دن رَین یہ کھیل کود کے یہ حق نمائیاں
صدقے ہوئیں حسینؑ پہ دونوں کلائیاں
ایسے ہی ہاتھ کرتے ہیں مشکل کشائیاں
قربانیاں ہوئی تھیں جہاں رنگ لائی ہیں
ایسے ہی جاں نثاروں نے قومیں بچائی ہیں

(51)

بے دست ہو کے خاک پہ تڑپا وہ مہ جبیں
کیا جانے ایک آہ بھی کی اُس نے یا نہیں
شاید لبِ حسینؑ سے نکلی ہو آفریں
آغوش ماں کی دور تھی اور موت تھی قریں
اک تیر کھا کے حلق پہ بے جان ہوگیا
فدیہ تھا جس کا اُس کی ہی گودی میں سو گیا

(52)

انصارِ باوقار کے لاشے وہ چار سو
جن سے وفا کا نام محبت کی آرزو
واللہ کیا مآل تھا کیا ذوقِ جستجو
صل علیٰ نبیؐ کے لہو میں ملا لہو

اپنوں کی طرح ساتھ دیا کیا سعید تھے
دو اِن مجاہدوں میں بھی کم سِن شہید تھے

(53)

دولھا کے ساتھ خاک پہ سوئی ہوئی برات
آغوش نینوا میں تھی یثرب کی کائنات
نظارۂ جمال سے حیرت میں شش جہات
ایک ایک کی جبیں پہ وہ تابانیِ حیات

مقتل میں چاند سے نظر آتے تھے دور سے
روشن جبینِ شام تھی چہروں کے نور سے

(54)

اُس یادگار صبح کی وہ یادگار شام
وہ قتل گہ کے سامنے جلتے ہوئے خیام
میدان میں حسینؑ کے اہلِ حرم تمام
بچوں کی عورتوں کی اسیری کا اہتمام

بازو بھی ریسمان بھی طوق اور گلو بھی تھا
کامل تھا ظلم آگ بھی تھی اور لہو تھا

(55)

لرزاں مثالِ بید وہ دنیائے آب و گل
وہ کارواں لٹا ہوا لاشوں کے متصل
خیموں کی طرح سینوں میں جلتے ہوئے وہ دل
بچے بھی فرشِ خاک پہ خاموش و مضمحل

نازاں تھے جو حسینؑ پہ وہ دل نہیں رہے
فریاد العطش کے بھی قابل نہیں رہے

(56)

چھائی ہوئی فضا میں الم ناک خامشی
شامل ہوائے دشت میں وہ خون کی تری
بجھتی ہوئی خیام کے شعلوں کی روشنی
وہ غم میں وارثوں کے اسیرانِ زندگی

بیٹھے ہوئے زمیں پہ کلیجوں کو تھام کے
کھوئے ہوئے غریب دھندلکے میں شام کے

(57)

ایسے ہی سوگوار تھے جیسے کہ تھے حسینؑ
یہ صبر کا محل تھا کہ ہنگامِ شور وشین
خود داریوں پہ ان کی فدا جانِ مشرقین
باہر تھے گھر سے کر نہ سکے میّتوں پہ بین

غمگیں دلوں پہ جبر قیامت کا سہ گئے
نرغہ تھا دشمنوں کا تو جی گھٹ کے رہ گئے

(58)

بے خانماں تھے اور بھرے گھر کے سوگوار
اکبرؑ کے سوگوار تھے اصغرؑ کے سوگوار
سب ایک سمت جانِ پیمبرؐ کے سوگوار
اللہ ایک دن میں بہتّر کے سوگوار

ایسے میں ضبط سے کوئی کس طرح کام لے
کس کا یہ حوصلہ ہے کہ اشکوں کو تھام لے

(59)

تپتی ہوئی زمیں پہ وہ لاشے اِدھر اُدھر
بھائی کسی کا تھا تو کسی کا جواں پسر
وارث پڑا ہوا تھا کسی کا لہو میں تر
ٹکڑے دل و جگر کے اور اک دور کی نظر

جاتے ہوئے وداع نہ کرنے کو دیکھیے
مقتل سے قیدیوں کے گزرنے کو دیکھیے

(60)

کس درجہ دردناک تھا رخصت کا یہ سماں
کہتا کسی سے کون کہ خالق نگاہباں
اتنا بھی کوئی پوچھنے والا نہ تھا یہاں
زندوں پہ کیا گزر گئی کشتوں کے درمیاں

یوں تو حرم کی عمر ہی اِس غم میں سب کٹی
کس طرح قتل گاہ میں لیکن یہ شب کٹی

(61)

مشکل کشا کی آل پہ یہ وقتِ بے کسی
مرجائے جانِ فاطمہ پُرسا نہ دے کوئی
اک غم نصیب عمر تھی یہ ایک شب نہ تھی
اس درد کی کسک دلِ فطرت میں رہ گئی
وہ سوز و گداز نمایاں ہے آج تک
اُس دن کی شام شامِ غریباں ہے آج تک

(62)

کیا صبر میں جری تھے اسیرانِ تشنہ لب
ہمراہ جب تو لائے تھے شاہنشہِ عرب
اللہ جانتا ہے اٹھائے ہیں جو تعب
اِتنا بھی تو ہُوا نہیں تسکین کا سبب
فطری تھا حق پر اُس کی اجازت نہیں ملی
لاشوں کے دفن کرنے کی مہلت نہیں ملی

(63)

یہ بے وطن غریب مسافر شکستہ حال
جو وارثوں کے سوگ میں کھولے ہوئے تھے بال
جو نیم جاں تھے بھوک سے جو پیاس سے نڈھال
اے نجم آج ان کی سیاست ہے لازوال
حیرت سے شام و کوفہ کے ارکان دنگ تھے
تختے الٹ دیے وہ اسیرانِ جنگ تھے

ہنگامِ عصر ختم ہوئی جنگِ کربلا
اِک دوسرے جہاد کا آغاز ہوگیا
تکمیلِ کار کے لیے بیمارِ غم اُٹھا
اب اُس کے دوش پہ تھا نشاں انقلاب کا

قیدِ ستم میں شیرِ خدا کا ہزبر تھا
تا شام ایک معرکۂ ضبط و صبر تھا

○

پروفیسر سیّد احتشام حسین

مقدّمہ

مرثیہ — معراجِ فکر

اردو مرثیے کی فنی تاریخ طرز اظہار کے تعین کی تاریخ بھی کہی جاسکتی ہے، کیونکہ ابتدائی دور کے مرثیوں میں جہاں مواد اور موضوع کو سرسری حیثیت سے پیش کیا جاتا ہے، وہیں اس کی ہیئت اور ظاہری ساخت کی جانب سے بھی بے اعتنائی برتی گئی تھی، لیکن جب ایک بار ہیئت کا مسئلہ حل ہوگیا اور اہم ترین مرثیہ نگاروں نے مسدس کو مرثیہ نگاری کے لیے مخصوص کردیا تو موضوع کی وسعت پر بھی نظر گئی کیونکہ مسدّس محض اظہار تاثر کے لیے موزوں نہ تھا، بلکہ واقعات اور خیالات کے پھیلاؤ کا مطالبہ کرتا تھا۔ عربی، فارسی اور اردو کے قدیم مرثیہ نگاروں نے مرثیے کو واقعہ کربلا اور غم امام حسینؑ کے اظہار کا آلہ کار قرار دیا تھا۔ وہ زیادہ تر رونے رلانے کے لیے امام حسینؑ کی شہادت اور مصائب کے متعلق اپنے تاثرات بیان کرتے تھے اور عقیدت و ارادت کا سہارا لے کر شاعری کے فنی پہلوؤں سے بے نیاز ہوجاتے تھے۔ مرزا محمد رفیع سوداؔ نے اس کے خلاف احتجاج کیا۔ ان کا نقطۂ نظر یہ تھا کہ اگر مرثیہ گوئی فن ہے اور مرثیہ اصنافِ شعری میں سے ایک صنف ہے تو شاعر محض یہ کہہ کر بری الذمہ نہیں ہوسکتا کہ اس نے جو کچھ لکھا ہے اس کا تعلق اظہار غم و الم سے ہے، شاعری سے نہیں ہے۔ اس خیال سے سوداؔ نے شعوری طور پر مرثیے کی فنی اصلاح پر زور دیا اور نتیجہ یہ ہوا کہ ان کے بعد سے مرثیے نے اہم ادبی حیثیت اختیار کرلی اور غزل، قصیدہ، مثنوی کی طرح اسے بھی بلند پایہ اور اہم اصناف میں جگہ دی گئی۔ یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ فنی ارتقا کے ساتھ ساتھ مرثیے کی معنوی حیثیت بھی بلند ہوگئی۔ مرزا رفیع سوداؔ کے مرثیوں میں اس وقت تک تمام

دوسرے مرثیہ گویوں کے مقابلے میں زیادہ جان ہے۔

سوداؔ نے مرثیے میں اصلاح کا جو سلسلہ شروع کیا تھا، وہ اصلاح کی منزل سے گزر کر تعمیری حسن کی منزل تک پہنچا، اور سوداؔ کے فوراً بعد آنے والے مرثیہ گویوں نے واقعہ کربلا کی عظمت کے احساس کو اعلیٰ ترین فنّی روپ دینے کی کوشش کی۔ خلیقؔ، ضمیرؔ اور فصیحؔ کے مرثیے اس کی شہادت پیش کرتے ہیں۔ اس دور میں اور ان فن کاروں کے ہاتھوں مرثیے کے خط و خال واضح ہونے لگے اور اس کی شاعرانہ خصوصیات پر توجہ کرنے کے ساتھ اس حادثہ عظیم کے واقعاتی پہلو بھی سامنے آنے لگے۔ یہ اودھ میں شیعیت کے فروغ کا زمانہ تھا۔ مرثیے کے لیے مناسب فضا موجود تھی۔ مرثیہ نگاری اہم شاعرانہ خدمت سمجھی جاتی تھی۔ مرثیہ خواں عزت کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا۔ امیر و غریب، عالم اور جاہل سب مرثیوں سے تاثر حاصل کرتے تھے اور چونکہ اُس وقت تک مجالس میں حدیث خوانی کا بہت زیادہ فروغ نہیں ہوا تھا اس لیے مرثیہ خوانی ہی کو اہمیت حاصل تھی۔ صورت حال یہ تھی جب میر انیسؔ، مرزا دبیرؔ اور بعض دوسرے شعراء نے مرثیہ کو ئی اور مرثیہ خوانی کے وزن و وقار میں غیر معمولی اضافہ کیا، جہاں تک مرثیے کے مرثیہ ہونے کا تعلق ہے اس کی ہیئت کی تکمیل ہوگئی بلکہ شاید یہ کہنا صحیح ہو کہ بہار و خزاں کے ذکر، ساقی نامہ، گھوڑے اور تلوار کی تعریف جیسے عناصر نے آرائش و زیبائش کا وہ سامان بھی مہیا کر دیا جس کے نہ ہونے سے مرثیے کے بنیادی تصور میں کوئی کمی نہیں رہ سکتی تھی۔ چنانچہ آج بھی مرثیے کے نام سے جو نظمیں واقعہ کربلا کے متعلق لکھی جا رہی ہیں ان کے لیے مسدّس ہی کا استعمال ضروری سمجھا جاتا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ ہیئت بیانیہ تاثیراتی اور فکری ہر رنگ کے لیے مناسب ہے اور چونکہ تحت اللفظ خوانی میں بھی مسدّس سے مدد ملتی ہے اس لیے ہر وہ مرثیہ جو اس طرح پڑھنے کے لیے لکھا جاتا ہے، مسدّس ہی کی شکل میں ہوتا ہے۔ اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ مرثیے کی یہ معین ہیئت ہے، مرثیہ اپنی ہیئت کے اعتبار سے مرثیہ ہوتا ہے۔ اسے کسی شکل میں لکھ سکتے ہیں لیکن عملاً اس کی یہی شکل سب سے زیادہ کارآمد اور کامیاب معلوم ہوتی ہے، اسی وجہ سے دورِ جدید کے شعرا نے بھی اس ہیئت کے بدلنے کی کوئی کوشش نہیں کی۔ میر انیسؔ اور مرزا دبیرؔ کے شاگرد اور متبعین تو مرثیہ مسدس کی شکل میں لکھتے ہی رہے، دوسرے شعرا نے بھی یہی روش جاری رکھی۔ موجدؔ سرسوی،

جعفر علی خاں اثر لکھنوی، جوش ملیح آبادی، آل رضا لکھنوی، فارغ بخاری، زائر سیتاپوری، ناصر زیدپوری، نجم آفندی اور بعض دوسرے شعراء جو اپنے اپنے نقطۂ نظر رکھتے ہیں اور جو غالباً کلاسکی مرثیہ نگاری کا تتبع باقاعدہ نہیں کرتے، مرثیہ لکھتے وقت مسدس ہی کا انتخاب کرتے ہیں۔ اس طرح مرثیہ کی ظاہری شکل کا مسئلہ اس وقت شعراء کے لیے الجھن کا سبب نہیں ہے لیکن موضوع اور مواد کی پیش کش کا مسئلہ ضرور غور وفکر کا مرکز بنا ہوا ہے۔ کلاسکی مرثیوں میں جن عناصر کو تقریباً ترتیب وار پیش کرنے کی کوشش کی جاتی تھی، موجودہ شعراء بعض وجوہ سے اس کی پیروی نہیں کررہے ہیں۔ محض بیانیہ انداز نظر کی جگہ تاثراتی اور فکری انداز نظر پر زور دیا جارہا ہے اور ہیئت سے زیادہ معنویت پر۔ یہ بھی دورِ جدید کے تقاضوں کا نتیجہ ہے جس طرح حدیث خوانی اور ذاکری کا طرز بدلا ہے، روایت میں درایت کی آمیزش ہوئی ہے، خطابت میں استدلالی رنگ پیدا کرنے کی کوشش کی گئی ہے، اسی طرح مرثیہ گوئی میں بھی تغیر ہوا ہے۔ مرثیہ نگار وقت کی آواز پر کان دے رہا ہے اور فن کے تقاضوں کے اندر ہی اندر جذبات عقیدت میں حقائق کی آمیزش کر رہا ہے۔

ممکن ہے حضرت نجم آفندی کے نو تصنیف مرثیہ ''معراج فکر'' سے پوری طرح لطف اندوز ہونے میں بعض حضرات کو ان چند تمہیدی سطروں سے کچھ مدد ملے، کیونکہ یہ مرثیہ بھی ظاہری ساخت میں قدیم کلاسکی مرثیوں سے مشابہت رکھنے کے باوجود مختلف ہے۔ یہ اختلاف کہاں ہے اور کیوں؟ اس کی جستجو شاعر کے مزاج، وقت کے بدلے ہوئے انداز، واقعۂ کربلا کی جدید تشریح و تعبیر، مقصد مرثیہ نگاری اور سامعین کے ذوق وشعور کی روشنی ہی میں کی جاسکتی ہے۔ خوش قسمتی سے مجھے اس مجلس میں بھی شرکت کا اتفاق ہوا جس میں جناب نجم آفندی نے یہ مرثیہ ایک بڑے مجمع کے سامنے پیش کیا تھا، اس لیے یہ دیکھنے کا موقع بھی ملا کہ سامعین پر اس کا ردعمل کیا ہوا، اس کے کون سے حصے زیادہ پسند کیے گئے، کن بندوں پر زیادہ داد ملی اور واہ واہ، سبحان اللہ کے پردے میں کس قسم کے جذبات کا اظہار کیا گیا۔ پھر میں نے اس کو تنہائی میں غور سے پڑھا تاکہ اس فوری اور وقتی تاثر سے الگ ہوکر رائے قائم کرسکوں، جو اسے خود شاعر کی زبان سے سن کر ہوا تھا۔ اس سے قبل میں نجم آفندی کے قصائد، نوحہ جات، نظمیں، غزلیں، قطعات، بعض نثری تصانیف بھی

دیکھ چکا ہوں۔ انھوں نے 'فتح مبین' کے نام سے جو مرثیہ تقریباً پندرہ سال پہلے لکھا تھا، وہ بھی میری نظر سے گزر چکا ہے۔ اس لیے اس مرثیہ کے بعض پہلوؤں پر روشنی ڈالتے وقت میرے پیش نظر وہ مجموعی تاثر بھی ہے جو میں نے ان کی شاعری اور شخصیت کے متعلق قائم کیا ہے، اور وہ کیف بھی جو 'معراج فکر' کے مطالعہ سے حاصل ہوا ہے۔

جناب نجم آفندی دور جدید کے ان شعراء میں سے ہیں جنھیں بجا طور پر استادی کا مرتبہ حاصل ہے۔ ان کی عمر ریاض سخن میں بسر ہوئی ہے۔ تقریباً پچاس سال سے ان کی شاعری پر ان شعراء کی صحبتوں میں جلا ہوتی رہی ہے جن میں سے ہر ایک خود اردو شاعری میں اپنا ایک مقام رکھتا ہے۔ انھوں نے بچپن ہی سے اکبر آباد (آگرہ) کی علمی اور ادبی مجلسوں میں شریک ہوکر زبان و بیان کے لطیف مسائل پر غور کیا اور انھیں برتا ہے۔ اپنے والد مرحوم کے استادانہ رنگ سے کسب فیض کرنے کے علاوہ انھوں نے اساتذہ کا کثرت سے مطالعہ کیا ہے۔ اس لیے ان کے کلام میں ابتداء ہی سے ایسی پختگی اور ہمواری پیدا ہوگئی ہے جو بڑے ریاض کا نتیجہ کہی جاسکتی ہے۔ لیکن کوئی شاعر کتنے ہی سرچشموں سے فیض اٹھائے اس کے کلام میں زور، تازگی، جدت، گرمی اور سرمستی کے عناصر اس وقت تک پیدا نہیں ہوسکتے جب تک کہ وہ مسائل اور واقعات پر اپنے مخلصانہ نقطۂ نظر سے غور نہ کرتا ہو۔ یہ بات صرف مذہب کے لیے نہیں، زندگی کے ہر پہلو کے لیے صحیح کہی جاسکتی ہے کہ اس میں ''عقیدے'' کی آگ کا ہونا ضروری ہے ورنہ اس کا اظہار مصنوعی اور بے روح ہوگا۔ یہی ایک اچھے فن کار کی پہچان ہے کہ اس کا موضوع ہی اس کی زندگی اور روح ہو، اس کا بیان اس کے خلوص قلب کا آئینہ ہو، اور اس کے خیالات و تصورات کی گرمی اس کے الفاظ اور فقروں سے پھوٹی پڑ رہی ہو۔ نجم آفندی کی ساری شاعری میں یہ خصوصیت اس شدت سے نمایاں ہے کہ ان کے چند اشعار کا مطالعہ بھی ان کے جوش عقیدت کی غمازی کرنے لگتا ہے۔ ان کی مذہبی نظموں میں یہ بات ہر ہر لفظ سے نمایاں ہوتی ہے، لیکن وہی اس بات کا پتہ بھی دیتی ہے کہ اس والہانہ عقیدت کی بنیاد گہرے شعور اور استدلالی تیقن پر ہے۔ اندھی عقیدت اپنی نیک نیتی کے باوجود سطحی اور ہلکی ہوتی ہے۔ عقیدے کا عرفان گہرائی، شدت اور قوت پیدا کرتا ہے، یہی وہ منزل ہے جو نجم آفندی کے ساتھ مخصوص ہے۔ ان کا عقیدہ علم و عرفان کا آفریدہ

ہے۔ ان کا یقین ادراک وشعور کا پیدا کردہ ہے، اس لیے ان کی شاعری میں ان کی روح کی آواز سنائی دیتی ہے جسے ان کی جدت طراز طبیعت ایک ایسے زاویے سے پیش کردیتی ہے جس پر دوسروں کی نگاہ نہیں گئی تھی۔

واقعۂ کربلا کے کچھ تاریخی پہلو ہیں، کچھ اعتقادی وجذباتی، کچھ ایسے ہیں جن میں عالم انسانیت کے لیے پیام روح اور درس اخلاق ہے، بعض پہلو ایسے ہیں جن میں شدید المیہ عناصر موجود ہیں اور بلا قید مذہب وملت انسان کے جذبات کو جھنجھوڑ دیتے ہیں۔ شعراء نے ان تمام پہلوؤں سے کام لیا ہے۔ جناب تجمّ آفندی نے بھی اپنے اندازِ نظر کے مطابق انھیں ''معراج فکر'' میں جگہ دی ہے لیکن ان کا نقطۂ نظر واقعات سے متعلق جذبات کے انتخاب سے ظاہر ہوجاتا ہے اور انھیں دوسرے شعراء سے امتیاز بخشتا ہے۔

ان حقائق کی روشنی میں زیرِ نظر مرثیے پر نگاہ ڈالی جائے تو صرف اس بات کی ضرورت ہوگی کہ ہر موقع اور ہر تصور سے متعلق مثالیں فراہم کردی جائیں لیکن شاید اس طرح اس مختصر مرثیے کے زیادہ تر بند مقدمے ہی میں جگہ پاجائیں گے کیونکہ اس کا انداز بیانیہ نہیں فکری ہے اور واقعات کے بیان کا مقصد شہادتِ حسینؑ کے کسی مخصوص پہلو کی تشریح ہے۔ اس مرثیے میں جناب تجمّ کے پیشِ نظر امام حسینؑ، ان کے اعزاء اور احباب کی شہادت کا دل دوز بیان نہیں ہے بلکہ ان کی جانب ہلکے ہلکے اشارے کرکے ان سے وہ نتائج اخذ کرنا ہے جو آج کے انسان کے لیے فکر و عمل کا سنگم بن سکتے ہیں، بلکہ کبھی کبھی تو ایک ہی بند کے اندر اتنے خیال انگیز اشارے جمع کردیے گئے ہیں کہ ان کی تشریح میں کئی کئی ورق سیاہ کیے جاسکتے ہیں۔ ایسا صرف اس لیے ہے کہ شاعر کو واقعۂ کربلا کی جس عظمت وجلالت کا احساس ہے وہ فکر وشعور کی منزلوں سے گزر کر اس کے ہاتھ آیا ہے، مثال کے طور پر اس بند کے چھ مصرعوں پر غور کیجیے۔

جس نے امورِ خیر کو بخشی حیاتِ نو　　جس کی نوائے درد میں ہے زندگی کی رو
صدیوں سے جس کے نقشِ قدم دے رہے ہیں ضو　　جو سوگیا بڑھا کے چراغِ وفا کی لو
بدلی عمل کی شکل ارادے بدل دیے
جس نے مطالبات کے جادے بدل دیے

یہاں کسی واقعہ کا بیان مقصود نہیں ہے، کسی مخصوص حادثے کی طرف اشارہ نہیں ہے۔ جس کے سامنے شروع سے آخر تک سارا واقعہ کربلا نہ ہو، امام حسینؑ کی قربانی کا مقصد پیش نظر نہ ہو، تاریخ عالم پر اس کے اثرات کا علم نہ ہو، سوال بیعت اور اس کے جواب کے انوکھے پن پر نگاہ نہ ہو، وہ اس بند کے مضمرات سے پوری طرح لطف اندوز اور متکیف نہیں ہوسکتا۔ اسی کو میں فکری عنصر کہتا ہوں جو قدیم مراثی میں بہت کم پایا جاتا ہے۔

یا اس بند پر غور کیجیے

کچھ حُسن کی نمود تھی کچھ عشق کا مزاج　　آیا نظر جو صبر و شجاعت کا امتزاج
حق نے رکھا شہادتِ عظمیٰ کا سر پہ تاج　　ملتا ہے آنسوؤں کا جسے آج تک خراج
منھی میں تھا لیے ہوئے موت اور حیات کو
کس دبدبے سے فتح کیا کائنات کو

یہ امام حسینؑ کی ظاہری شکست میں چھپی ہوئی باطنی فتح کے پیش کرنے کا انوکھا انداز ہے یہاں بھی واقعات و حادثات کی طرف کوئی اشارہ نہیں ہے۔ کسی مخصوص موقع کا بیان نہیں ہے لیکن شہادتِ حسینؑ نے جو نتائج پیدا کیے تھے، ان کا احساس ہے اور وہی احساس عقیدے کی گرمی کے ساتھ شعر کے سانچے میں ڈھل گیا ہے۔ اسی طرح مختلف بندوں میں الگ الگ تاثر پاروں نے مرثیے کی فضا پیدا کرنے کے ساتھ ساتھ اس پیام کو بھی اجاگر کردیا ہے جو اس زبردست قربانی میں مضمر تھا۔

جناب نجم نے اس مختصر مرثیے میں اس بات کا التزام رکھا ہے کہ جگہ جگہ پر واقعات کا تسلسل بھی برقرار رہے تاکہ مرثیے سے جو ذہنی اور جذباتی وابستگی ہے، وہ بھی آسودہ ہوتی رہے، لیکن ایسے مواقع پر انھیں غیر معمولی اختصار سے کام لینا پڑا ہے۔ مثلاً ایک موقع پر انصارِ حسینؑ کی قربانیوں کا تذکرہ ہے۔ اس کے بعد ہی چند اعزا کا ذکر ہے اور اسی ترتیب سے ہے جیسے عام طور پر مرثیہ نگار پیش کرتے رہے ہیں، لیکن پھر یہاں یہی بات ظاہر ہوتی ہے کہ ان بندوں میں بیان واقعہ کے بجائے تاثرات ہی کے اظہار سے کام لیا گیا ہے۔ مختصر مرثیے میں اس کے سوا اور کوئی صورت ممکن بھی نہیں تھی۔ جہاں انصار کا تذکرہ آتا ہے، وہاں پہلا ہی بند شاعر کے مقصد کا

ترجمان بن جاتا ہے۔

کیا ربط آج موت کو ہے زندگی کے ساتھ　　کتنے ادا شناس ہیں سبطِ نبی کے ساتھ
پھر یہ ہجومِ شوق نہ ہوگا کسی کے ساتھ　　مرنے کو یوں نہ جائیں گے انساں خوشی کے ساتھ

سن کر سفیرِ مرگ کے قدموں کی آہٹیں
ہونٹوں پہ جمع ہوں گی نہ پھر مسکراہٹیں

اس میں انصارِ امامؑ کے شوقِ شہادت، عرفانِ حقیقت، جذبۂ مودت، وفورِ شجاعت کے متعلق کتنے لطیف اشارے یکجا کر دیے گئے ہیں۔ اس بند کا پڑھنے یا سننے والا اگر امامؑ کے اصحاب سے واقف ہو، تو اس کی نگاہ تصور کے سامنے نہ جانے کتنے واقعات آجائیں گے۔

اس طرح کے مرثیے میں یہ بات ضرور ہوتی ہے کہ اس کے سارے مضمرات اور رموز و نکات کو وہی لوگ اچھی طرح سمجھ سکتے ہیں جنھیں واقعۂ کربلا کا تفصیلی علم ہے۔ محض چونکا دینے والے واقعات آتے ہیں، واقعہ کی تصویر نگاہوں کے سامنے نہیں آتی لیکن غالباً اس مرثیے کا مقصد بھی یہی ہے کہ اس کے پڑھنے اور سننے والوں کے دل میں واقعہ کی تفاصیل، عظمت اور اہمیت کے جاننے اور سمجھنے کے لیے کرید پیدا ہو۔ بہرحال جیسا کہ میں نے عرض کیا، اس مرثیے کا ہر بند غور و فکر کے لیے نئے دروازے کھولتا ہے اور کو قدیم کلاسکی مرثیوں کے مقابل میں اس طرح کے نئے مرثیوں میں وہ حُسنِ تعمیر نہیں ہوتا جس سے مرثیے نے عظمت حاصل کی تھی لیکن جدید مرثیے موجودہ دور کے مزاج سے زیادہ ہم آہنگی رکھتے ہیں۔ اسی لیے ان کی جگہ ادب میں محفوظ ہے۔

مجھے یقین ہے کہ اس مرثیے کو نہ صرف عقیدت مندوں کے حلقے میں مقبولیت حاصل ہوگی بلکہ اس کا ادبی حسن، شاعرانہ خلوص اور فنکارانہ بیان اس کا مطالعہ کرنے والوں کے دائرے کو وسیع کر لے گا۔ اور اس سے وہ مقصد پورا ہوگا جو شاعر کے پیشِ نظر یعنی لوگوں میں واقعۂ کربلا کے متعلق غور و فکر کا وہ جذبہ پیدا ہو جس کا تعلق اس کے روح پرور اور جاں فزا پیام سے ہے۔

○

مرثیہ

معراجِ فکر

ع: صورت گرِ جلالتِ اسلام ہے حسینؑ

73 بند

تصنیف 1959ء

علامہ کے غیر مطبوعہ مرثیہ کے چند بند (بخط نجم آفندی)

(1)

صورت گرِ جلالتِ اسلام ہے حسینؑ
اک مرکزِ روابطِ اقوام ہے حسینؑ
فکر و نظر مشیت و الہام ہے حسینؑ
محبوبِ اہل درد بس اک نام ہے حسینؑ
دریا مخالفت کے چڑھے اور اُتر گئے
باقی رہا یہ نام حوادث گزر گئے

(2)

انسانیت کو جس نے سنوارا ہے وہ حسینؑ
جو حُسنِ معنوی کا سہارا ہے وہ حسینؑ
جس نے دلوں میں درد اُبھارا ہے وہ حسینؑ
روحِ بشر کو جس نے پکارا ہے وہ حسینؑ
آواز جس کی دُور کے انسان تک گئی
بجلی سی سامعہ کی فضا میں چمک گئی

(3)

خود دار زندگی کا جو حامی ہے وہ حسینؑ
عزّت کی موت کا جو پیامی ہے وہ حسینؑ
جو خالقِ شعورِ عوامی ہے وہ حسینؑ
ہر قوم کی نظر میں گرامی ہے وہ حسینؑ
واقف نہیں بشر جو پیمبرؐ کے نام سے
مانوس ہیں حسین علیہ السلام سے

(4)

آئینہ ہے جبینِ ازل جس کا وہ حسینؑ
ممکن نہیں جہاں میں بدل جس کا وہ حسینؑ
ہے گیسوئے حیات میں بل جس کا وہ حسینؑ
حُسن آفریں ہے دخل و عمل جس کا وہ حسینؑ
ہر منزل اس کی منزلِ صبر آزما بنی
مکہ بنا مدینہ بنا کربلا بنی

(5)

معراجِ فکر جس کی ہر اک بات وہ حسینؑ
قرآں کی شرح جس کے ہیں حالات وہ حسینؑ
جس کے تصوّرات ہیں آیات وہ حسینؑ
ممکن ہیں جس کے آگے محالات وہ حسینؑ
جس کی وغا نہ وقت کے اسرار حل کیے
صدہا برس کے عقدۂ دشوار حل کیے

(6)

جو حق کی معرفت کا ہے مفہوم وہ حسینؑ
جس کا خیال و خواب ہے معصوم وہ حسینؑ
جس کے ثباتِ عزم کی ہے دھوم وہ حسینؑ
جس کا ہے نام قوتِ مظلوم وہ حسینؑ
مظلومیت کو عزم دیا حوصلہ دیا
اظہارِ حق کا جس نے سلیقہ سکھا دیا

(7)

اقدام جس کا سب سے نرالا ہے وہ حسینؑ
جو غم کی تیرگی کا اُجالا ہے وہ حسینؑ
ملّت کا جو سنبھالنے والا ہے وہ حسینؑ
جو فاطمہؑ کی گود کا پالا ہے وہ حسینؑ
دوشِ پیمبریؐ پہ جو معراج پا گیا
جو زیرِ تیغ اتنی بلندی سے آ گیا

(8)

جو آج بھی ہے رہبرِ افکار وہ حسینؑ
ذہنوں کو کر رہا ہے جو بیدار وہ حسینؑ
دنیا تھی جس کے درپئے آزار وہ حسینؑ
اب بھی بہت ہیں جس کے گنہگار وہ حسینؑ
جس نے دیا ہے درسِ عمل حق کی راہ میں
ہم جیسے بے عمل بھی ہیں جس کی نگاہ میں

(9)

جس کی نگاہ قوم کی فکر و نظر پہ ہے
جس کی نگاہ مصرفِ ہر خیر و شر پہ ہے
جس کی نگاہ اپنے لہو کے اثر پہ ہے
جو بے خبر ہے اس پہ نہیں با خبر پہ ہے
امروز ہے نگاہ میں فردا ہے سامنے
ایک ایک فردِ قوم کا چہرا ہے سامنے

(10)

جس نے امورِ خیر کو بخشی حیاتِ نو
جس کی نوائے درد میں ہے زندگی کی رَو
صدیوں سے جس کے نقشِ قدم دے رہے ہیں ضو
جو سوگیا بڑھا کے چراغِ وفا کی لَو
بدلی عمل کی شکل ارادے بدل دیے
جس نے مطالبات کے جادے بدل دیے

(11)

تاریخِ روزگار پہ تنقید جس نے کی
ہر اک غلط اصول کی تردید جس نے کی
قدرت کے نظم و ضبط کی تائید جس نے کی
اسلام کے پیام کی تجدید جس نے کی
پھر بڑھ چلا تھا زور جو باطل کا گھٹ گیا
پردہ سا ایک روئے حقیقت سے ہٹ گیا

(12)

جس نے کیے مقاصدِ صبر و رضا بلند
جس نے کیے معانیِ حرفِ وفا بلند
جس نے کیے منازلِ درو آزما بلند
ممنون سب اسی کے ہیں کیا پست کیا بلند
منعم کو شکرِ نعمتِ حق کا سبق دیا
جس نے غریب قوم کو جینے کا حق دیا

(13)

بگڑی ہوئی تھی صورتِ دنیائے آب و گِل
چہروں پہ رنگ و روپ تھا روحیں تھیں مضمحل
وہ خبثِ نفس تھا کہ شرافت تھی منفعل
اخلاق کے نظام میں اغراض تھے مخل
خود داریِ حیات کی پائندگی نہ تھی
جینے کو جی رہے تھے مگر زندگی نہ تھی

(14)

زندہ کیے حسینؑ نے اسلام کے اصول
اُس نے عوض نبیؐ کے شہادت بھی کی قبول
مستجمع الصفات ہوئے اس طرح رسولؐ
ادراک دم بہ خود ہوں کہ حیران ہوں عقول
اک آیۂ جلی ہے یہ سرِّ خفی نہیں
منصب تو ہے نبیؐ کا اگر وہ نبیؐ نہیں

(15)

وہ عارفِ جلیل تھا آگاہِ رسم و راہ
جو کہہ گیا حسینؑ کو بنیادِ لا الٰہ
اسلام دینِ مصطفویؐ ہے خدا گواہ
لیکن اک اہلِ دل نے کہا یہ بہ اشک و آہ
کہنے میں بات آتی ہے چُپ کیوں رہے کوئی
برحق ہے اب جو دینِ حسینؑ کہے کوئی

(16)

ہر قوم میں ہے جس کی شہادت کا احترام
دُنیا میں جس کا نام ہے اک مستقل پیام
اس درجہ اس کا ذکر ہے مقبولِ خاص و عام
ہر اک زباں کے شعر و ادب میں ملا مقام
تقریر و نظم و نثر کی کچھ انتہا نہیں
اب تک کسی کا تذکرہ اتنا ہُوا نہیں

(17)

جس کی وِلا میں ہیں لبِ انسانیت پہ بین
ہر عہد میں بلند ہے آوازِ شورو شین
لاکھوں عزا کو اس کی سمجھتے ہیں فرض عین
ہر روز ہے کہیں نہ کہیں مجلسِ حسینؑ
اس شان کا غم اور مثالی نہیں کوئی
لمحہ بھی اس کے ذکر سے خالی نہیں کوئی

(18)

صدیوں سے جس کی مدح سرائی کا دَور ہے
ہر دَور میں یہ مسئلۂ فکر و غور ہے
اس باب میں سکوت طبیعت پہ جَور ہے
محرومِ درد ہو کوئی یہ بات اور ہے
جو اہلِ دل ہے دست نگر کربلا کا ہے
ہر ملک کے ادب پہ اثر کربلا کا ہے

(19)

توریت میں بھی جس کی شہادت کا ہے بیاں
ہوتا ہے کچھ زبور سے بھی ماجرا عیاں
انجیل بھی ہے جس کے منازل کی ترجماں
یہ جملہ انبیاؑ کے صحائف ہیں ہم زباں
تنظیمِ کائنات کا قلبِ صمیم ہے
قرآن میں وہ معنیِ ذبحِ عظیم ہے

(20)

جو ظلم کر رہے ہیں علوم و فنون پر
غدّار متحد ہیں حقائق کے خون پر
تصنیفِ ابنِ تیمیہ و خلدون پر
کیا تبصرہ کرے کوئی ان کے جنون پر
اُس عہد میں نہ تھے یہ تقاضے اِسی کے ہیں
یہ بھی شریک خون میں سبطِ نبیؐ کے ہیں

(21)

بے امتیاز مذہب و ملّت ہے جس کا سوگ
اکثر مٹادیا ہے تعصّب کا جس نے روگ
کتنے ہیں اب قریب بہت دور تھے جو لوگ
نامسلموں نے عشق میں جس کے لیا ہے جوگ
بھارت نواسیوں کو خطاب اک نیا دیا
کتنے برہمنوں کو حسینیؑ بنا دیا

(22)

حیرت میں عقل اس کے نظامِ عمل پہ ہے
حق بیں نگاہ حُسن دوامِ عمل پہ ہے
دل بے قرار دردِ پیامِ عمل پہ ہے
کتنا بلند اپنے مقامِ عمل پہ ہے
قوموں کے رہبروں کو ہے فخر انتساب سے
سب نور لے رہے ہیں اسی آفتاب سے

(23)

حاصل یہ جس کے غم کو ہوئی عظمتِ گراں
قیدِ زماں ہے اور نہ پابندیِ مکاں
اب تک جو ہے محبتِ برحق کا ترجماں
خود واجب الوجود ہے جس کا نگاہباں
ہر غم کا زور چار ہی اشکوں میں بہہ گیا
یہ غم جہاں میں حق کی اشاعت کو رہ گیا

(24)

آدمؑ نے کی ہے نشرِ حقیقت کی ابتداء
یہ سلسلہ ازل سے ہے تاختمِ انبیاءؑ
کیا کیا پیمبروں نے دکھایا ہے حوصلہ
پر تکملہ حسینؑ کی تبلیغ نے کیا
جاری ہے اُس کے بعد بھی پیغام آج تک
غم اُس کا کر رہا ہے وہی کام آج تک

(25)

پہلے ہی سے رسولؐ کی محنت پہ تھا زوال
ہونے لگا دمشق میں جب اور غیر حال
اپنی غرض تھی کوئی نہ اپنا کوئی خیال
انسانیت کا درد تھا ملّت کا تھا سوال
قابض تھے جس پہ غیر وہ اُس کا مقام تھا
وہ ذمہ دارِ خلقِ خدا تھا امام تھا

(26)

مدت سے تھا حسینؑ پہ یہ راز آشکار
ہے دینِ حق کے بھیس میں شاہی کا اقتدار
بالکل بدل گیا ہے مسلمان کا شعار
اسلام کے اصول نہ اخلاقِ خوشگوار
جب سر میں ملک گیری کا سودا سمائے گا
غیروں کے سامنے یہی اسلام جائے گا

(27)

اُس وقت ہر لحاظ سے واجب تھا احتجاج
مرکز بنے ہوئے تھے امیروں کا تخت و تاج
ملّت کو ایسے راہ نما کی تھی احتیاج
ہر اعتبار سے ہو جو پیغمبری مزاج
جو اپنی جان دے کے رہِ حق پہ لا سکے
غم جس شہیدِ ظلم کا مُردے جِلا سکے

(28)

اثنائے راہ میں یہ کہا اُس نے بارہا
اندازۂ غلط میں نہ ہو کوئی مبتلا
یہ وہ سفر ہے موت کا ہے جس میں سامنا
یہ انکشافِ راز کلیجہ اُسی کا تھا
یوں بے نیازِ وقت ہو کس کی مجال ہے
پہلی اور آخری یہ انوکھی مثال ہے

(29)

اکثر ٹھٹک کے رہ گئے منزل کی راہ میں
دُنیا کا طمطراق تھا جن کی نگاہ میں
جو فرق کر سکے نہ سپید و سیاہ میں
جن کی جگہ نہ تھی دلِ ایماں پناہ میں
حُسنِ عمل کا بار اٹھانے سے ڈر گئے
حق کے قریب رہ کے زمانے سے ڈر گئے

(30)

غیر از امامؑ کون ہے اُس دن کا راز داں
کیا کیا تھے معرکے حق و باطل کے درمیاں
حجّت تمام کرنے کا یہ بھی ہے اک نشاں
اُس روز ہم شبیہہ پیمبرؐ نے دی اذاں
فوجِ عدوے دیں میں جو غفلت کا راج تھا
یہ لہجۂ رسولؐ میں اک احتجاج تھا

(31)

تکبیر کی صدا میں وہ توحید کا وقار
اک لفظ میں جلالت و عظمت کا اختصار
وہ اعترافِ رحمت و انعامِ کردگار
صحرائے بے گیاہ میں تسبیح کی بہار
سجدوں کی رفعتوں سے وہ دل بھی ملے ہوئے
پیشانیوں کے نور سے چہرے کھلے ہوئے

(32)

کیا منصبِ عظیم تھا کیا حُسنِ انتخاب
پیشِ خدا ابھی تھا وہ سجدے میں باریاب
نکلی ہٹا کے پردۂ شب صبحِ انقلاب
دیتی ہوئی دعا کہ ترا عزم کامیاب
معبد اسی زمیں پہ محبت بنائے گی
ظلمت چھٹے گی عقل بشر جگمگائے گی

(33)

کچھ حُسن کی نمود تھی کچھ عشق کا مزاج
آیا نظر جو صبر و شجاعت کا امتزاج
حق نے رکھا شہادتِ عظمیٰ کا سر پہ تاج
ملتا ہے آنسوؤں کا جسے مستقل خراج
مٹھی میں تھا لیے ہوئے موت اور حیات کو
کس دبدبے سے فتح کیا کائنات کو

(34)

وہ کربلائے دیدۂ و دل ساحلِ فرات
وہ منزلِ جمال و مقامِ تجلیات
ہونی تھی جس زمین پہ مابین کائنات
ایسی عظیم جنگ جو ہو مقصدِ حیات
قائم ہو جس سے عزتِ معیار زندگی
ہوجائیں بے نقاب اداکارِ زندگی

(35)

یہ جنگ انتظامِ شریعت کی جنگ تھی
باطل کی قوتوں سے حقیقت کی جنگ تھی
سرمایہ دار و صاحبِ محنت کی جنگ تھی
یہ حکمتِ بشر سے مشیت کی جنگ تھی
یہ جنگ آخری تھی ہدایت کی راہ میں
مہدیؑ کا انتظار ہے اب رزم گاہ میں

(36)

انسانیت شرافتِ غم سے تھی بے خبر
مظلومِ حسینؑ کا اللہ رے اثر
ہر سانس خوشگوار ہے ہر آہ معتبر
ہر عیش سے ہے آج یہ جذبہ بلند تر
غم تھے ہزار غم کو یہ عظمت ملی نہ تھی
آنسو تھے آنسوؤں میں حرارت کبھی نہ تھی

(37)

سمجھا نہ کوئی حق کی مشیت کا مدعا
کیا چار اشک ہیں یہ محبت کا مدعا
ایسے عظیم کار شہادت کا مدعا
بربادی و تباہیِ عترت کا مدعا
اک لمحہ بھی نہ صَرف کیا فکر و غور میں
یہ بات سوچنے کی تھی ہر ایک دور میں

(38)

یا لیتنی کا ذوق اور احساسِ کمتری
محروم ارتقا سے ہیں تنظیم سے بری
عزم و عمل ہے وہ نہ وہ ایثار پروری
مانی ہے کیا زبان ہی سے ان کی سروری
دیتے ہیں مشکلوں میں فقط ان کے واسطے
قربانیاں ہوئی تھیں اسی دن کے واسطے

(39)

جب سے ہوئی ہے خلقتِ دنیائے انس و جن
جب سے بشر کے ذہن میں تاریخ کا ہے سن
بھاری ہر ایک دن سے ہے عشرے کا ایک دن
کتنی قیامتوں میں تھا وہ نفسِ مطمئن
کیا منزلِ جہادِ شہِ مشرقین ہے
اُس دن کے میں نثار جو یومِ حسینؑ ہے

(40)

پیشانیِ سحر پہ وہ خاکسترِ ملال
تقریر وہ امام کی رَو جس کا تھا محال
لحنِ پیمبریؐ میں وہ کرّار کا جلال
اقدامِ حُر وہ حریتِ عزم کی مثال
خطبے کے لفظ لفظ میں تھی جانِ حریت
جاری کیا حسینؑ نے فرمانِ حریت

(41)

کیا ربط آج موت کو ہے زندگی کے ساتھ
کتنے ادا شناس ہیں سبطِ نبی کے ساتھ
پھر یہ ہجومِ شوق نہ ہوگا کسی کے ساتھ
مرنے کو یوں نہ جائیں گے انساں خوشی کے ساتھ
سن کر سفیرِ مرگ کے قدموں کی آہٹیں
ہونٹوں پہ جمع ہوں گی نہ پھر مسکراہٹیں

(42)

انصار تھے حسینؑ کے کیا کیا وفا پسند
تیور نبیؐ پسند ادائیں خدا پسند
پہلو میں دل ہر ایک کے تھا کربلا پسند
یہ دین کا فروغ تھا دنیا کو ناپسند
گل ہے چراغِ طور پہ قدرت خدا کی ہے
روشن جہاں میں شمع مگر کربلا کی ہے

(43)

تنوا سے بھی کم تھے اتنی جماعت تھی مختصر
لشکر کے اعتبار سے تنظیم کی مگر
آگے علم بدوش تھے عباسؑ نام ور
ممکن ہے ہو یہ مقصدِ سلطانِ بحر و بر
قلّت میں بھی یہ سطوت و اجلال چاہیے
تنظیم کا خیال بہرحال چاہیے

(44)

انصار میں حبیب کا بھی ہے عجب مقام
کوفے سے کیسا وقت پہ آیا ہے تیز گام
ہوتا ہے یوں خلوصِ عقیدت کا احترام
بنتِ نبیؐ کے خیمے سے آیا اُسے سلام
یہ فخر اپنے ساتھ وہ جاں باز لے گیا
اس تحفۂ سلام کا اعزاز لے گیا

(45)

آیا جو وقت ظہر کا مابینِ کارزار
آگے بڑھا نماز کو حیدرؑ کا ورثہ دار
تیر آرہے تھے لشکرِ اعدا سے بار بار
صف میں بڑھے ظہیر و سعیدِ وفا شعار
یہ جاں نثاریاں تھیں جو رُتبے بڑے ہوئے
اللہ یہ امامؑ سے آگے کھڑے ہوئے

(46)

دنیاے صبر و ضبط میں کیا معتبر رہے
سو زخم کھائے اپنی جگہ پر مگر رہے
کچھ دیر اپنے حال سے بھی بے خبر رہے
جب تک ہوئی نماز یہ سینہ سپر رہے
واجب سے جو اہم تھے فرائض ادا کیے
یہ شیرِ دل نمازِ مودّت پڑھا کیے

(47)

وہ ابن عوسجہ کی شہادت خدا کی شان
وہ سو برس کی عمر کا جنگ آزما جوان
کم سن پسر نے جس کی دکھائی یہ آن بان
بابا کے بعد بڑھ کے فدا کردی اپنی جان
انصار بے مثال عمل بے عدیل ہیں
یہ معرکے حسینی کے حق کی دلیل ہیں

(48)

انصار کو جہاد کی پہلے ملی رضا
خاموش تھے ادب سے عزیز اور اقربا
یہ مسئلہ ہے گرچہ بظاہر عجیب سا
شاید امامِ وقت کے پیش نظر یہ تھا
مرنا ہی سب کو ہے تو یہ پہلے نہ جائیں کیوں
کچھ دیر اور پیاس کی ایذا اٹھائیں کیوں

(49)

دل ایک عزم ایک تھا اور ایک رہ گزار
لیکن تھا راہ بر پہ ہر اک راز آشکار
ممکن ہے صبر و ضبط کی قوت پہ ہو مدار
یہ بات ہے اگر تو پھر اے دشتِ کار زار
اصغرؑ کے ہاتھ معرکۂ تشنگی رہا
یہ جاں نثار سبطِ نبی آخری رہا

(50)

انصار ہو چکے جو شہادت سے سرفراز
رخصت کو اقربا نے جھکائے سرِ نیاز
کیا کیا وفا پرست تھے عمرِ وفا دراز
مسلمؑ کے لاڈلوں کو یہ حاصل ہے امتیاز
جانیں پدر کی شان سے دیں کیا سعید ہیں
سنتے ہیں اقربا میں یہ پہلے شہید ہیں

(51)

بنتِ علیؑ کے لال وہ گل ہائے جعفری
کچھ سِن پہ منحصر نہ تھی جن کی غضنفری
طفلی نے کی ہے جنگ کے میداں کی رہبری
اس کم سنی میں موت سے کھیلے ہیں کیا جری
دنیا سے ہنستے کھیلتے دونوں چلے گئے
آتے ہوئے شباب کو لوٹا کے لے گئے

(52)

قاسمؑ وہ خانوادۂ ہاشم کا خوش جمال
کیا بچپنے میں تیغ زنی کی ہے بے مثال
دولھا بنا ہُوا تھا وہ زخموں سے تھا یہ حال
سہرا وفا کا اس کی جبیں پر ہے لازوال
دولھا جہاں میں پھر کوئی ایسا نہیں بنا
میدانِ کار زار کا دولھا نہیں بنا

(53)

کیا لرزہ خیز تھی علی اکبر کی جنگ بھی
تنہا پہ وار کرتے تھے ہر سمت سے شقی
سینہ فگار کر گئی برچھی کی اک انی
ملت نے کیا شبیہہ پیمبرؐ کی قدر کی
قبلِ ظہور وقت پلٹ کر نہ آئے گا
اب کوئی ہم شبیہہ پیمبرؐ نہ آئے گا

(54)

عباسؑ کو فرات پہ جانے کا حکم تھا
پانی لبِ فرات سے لانے کا حکم تھا
مشک و علم کا بار اٹھانے کا حکم تھا
خود اپنے تیوروں کو بجھانے کا حکم تھا
بابا کی طرح گرچہ شجاعت میں فرد تھا
وقت آ پڑا تو صبر کے میداں کا مرد تھا

(55)

پرچم وہ سوئے نہر اُڑاتا ہوا چلا
دیوار آہنی کو گراتا ہوا چلا
تیغوں کو برچھیوں کو ہٹاتا ہوا چلا
حیدرؑ کا زور یاد دلاتا ہوا چلا
جھک کر ذرا اٹھی جو نظر کائنات کی
لپٹی تھیں اس کے پاؤں سے موجیں فرات کی

(56)

عباسؑ اور وفا میں کچھ ایسا ہے اتحاد
ذکر وفا کے ساتھ ہی آتی ہے اس کی یاد
مشکیزہ بھر لیا یہی پیاسے کی تھی مراد
آئی اب فرات سے آواز ''زندہ باد''
اونچا علم سے بھی یہ وفا کا نشاں رہا
دریا پہ ہاتھ ڈال کے تشنہ وہاں رہا

(57)

کتنا عظیم ہے علیؑ اصغر کا ماجرا
اس دور میں یہ درد کی تاثیر دیکھنا
اک سرزمینِ عیش کا شاعر تڑپ اٹھا
اپنی زباں میں نظم کیا جس نے مرثیا
یہ شاہکار نذر بہ عجز و ادب دیا
معصوم ہستیوں کا ستارہ لقب دیا

(58)

جو کربلا کی عظمتِ غم کو بڑھا گیا
جو محنتِ حسینؑ کو محکم بنا گیا
قربانیوں پہ سارے شہیدوں کی چھا گیا
دنیا کی جدوجہد پہ جو مسکرا گیا
احساس جس کے سامنے ہر غم کا سرد ہے
کیا دل گداز اس کے تبسم کا درد ہے

(59)

ایسی بنائے ظلم ہے اس کے گلے کا تیر
جس سے نگاہِ غیر میں اسلام تھا حقیر
ہوتی ہی جارہی تھیں غلط فہمیاں کثیر
روکی ہمارے اشکِ عزا نے یہ دار و گیر
ماتم نے راز فاش کیے اہلِ شام کے
ہم نے بتا دیا وہ مسلماں تھے نام کے

(60)

خیمے میں کیا عجب ہے جو مادر کو ہو نہ چین
عالم یہ تھا کہ جیسے فضا کررہی ہو بین
میّت تھی شیر خوار کی اور شاہِ مشرقین
اصغرؑ کو دفن کرکے زمیں سے اٹھے حسینؑ
اُٹھ کر عنانِ صبر بس اک بار کھینچ لی
کیا دل پہ گزری ہوگی جو تلوار کھینچ لی

(61)

ہمت فزا ہے آج بھی سبطِ نبی کی جنگ
ماحولِ درد و غم میں یہ تیغِ افگنی کے ڈھنگ
کٹ کٹ کے گر رہے تھے سر و نیزہ و خدنگ
بالکل بدل چلا تھا زمیں آسماں کا رنگ
کچھ خوش نہ تھا وہ موت کی اس ترک و تاز میں
رخ سوئے فوج دل تھا خیالِ نماز میں

(62)

آپہنچا وقتِ عصر جو کچھ اور دِن ڈھلا
اُترا فرس کو روک کے سلطانِ کربلا
وہ پیاس کیا تھی اور وہ لشکر تھا کیا بلا
مارا گیا نماز میں زہراؑ کا لاڈلا
جرأت تھی لازوال وغا بے مثال تھی
کرتا اُسے شہید یہ کس کی مجال تھی

(63)

وہ عصرِ تنگ اور وہ دھندلکا سا شام کا
سورج غمِ حسینی میں وہ ڈوبتا ہوا
وہ دل گداز عالمِ ارواحِ انبیاء
فرطِ الم سے لرزہ براندام کربلا
قدسی سرِ نیاز و ادب خم کیے ہوئے
آغوش میں نواسے کو نانا لیے ہوئے

(64)

اہلِ حرم کو پہلے ہی کچھ کم نہ تھے ملال
خیمے جلے تو اور ہُوا سب کا غیر حال
سجاّد فرشِ خاک پہ تھے جس جگہ نڈھال
زینبؑ نے یہ بھتیجے سے آکر کیا سوال
جل جائیں پردہ دار کہ نکلیں خیام سے
پوچھا گیا یہ مسئلہ پہلا امامؑ سے

(65)

باہر ہوئے جو خیموں سے ماتم زدہ حرم
آیا قلق سے گردنِ انسانیت میں خم
تھی لاڈلی بتولؑ کی تصویرِ درد و غم
تپتی ہوئی زمیں تھی لرزتے ہوئے قدم
توفیق صبر و ضبط سے آنسو پیے ہوئے
تطہیر کا جلال تھا پردہ کیے ہوئے

(66)

خیمے تھے شعلہ بار تو میدان خوں چکاں
سویا ہُوا تھا رات کا بیدار کارواں
سب کے لبو ں پہ موجِ تبسم تھی ضو فشاں
ہم ایسے منچلے ہیں یہ چہروں سے تھا عیاں
دنیا نشان حوصلہ مندی بھی دیکھ لے
سر برچھیوں پہ ہیں یہ بلندی بھی دیکھ لے

(67)

بے سر وہ جسم ذوقِ شہادت کی آبرو
بکھرے ہوئے تھے چاند ستارے سے چار سو
زینبؑ نے کی نہ بیٹوں کے لاشوں کی جستجو
مقتل کی سمت لے چلی بھائی کے خوں کی بو
جس راہ کی تلاش تھی وہ راہ پا گئی
آواز جیسے حلق بُریدہ سے آ گئی

(68)

پہنچی جو قتل گاہ میں دیکھا یہ ماجرا
بے سر ہے فرشِ خاک پہ زہراؑ کا مہ لقا
خیبر کشا کی بیٹی کا اللہ رے حوصلا
لاشہ اٹھا کے ہاتھوں پہ زینبؑ نے کی دعا
قربانیِ حسین کا مقصد حصول ہو
یارب یہ نذر آلِ پیمبرؐ قبول ہو

(69)

اللہ یہ نبیؐ کے نواسے کی موت تھی
زینبؑ کا غم شریک ہو اتنا نہ تھا کوئی
برسا فلک سے خون زمیں تھر تھرا گئی
جو موج اُٹھی فرات سے سر پیٹتی اُٹھی
ماتم کا اہتمام کیا شش جہات نے
پُرسہ دیا امامؑ کا کُل کائنات نے

(70)

کِس درجہ دردناک تھا وہ وقت وہ مقام
خاموش فرطِ غم سے تھے اہل حرم تمام
غیرت سے بیکسوں کو نہ تھی طاقتِ کلام
بے رحم کررہے تھے اسیری کا اہتمام
آواز تھی بلند سکینہؑ کے بین کی
مقتل میں ہورہی تھی یہ مجلس حسینؑ کی

(71)

ہر دور میں رہے گی مجالس کی زیب و زین
بدلے یہ کائنات دہیں گے نہ دل کے بین
ہوگا نئے اصول سے پھر ماتمِ حسینؑ
سمجھیں گے اہلِ درد زیارت کو فرضِ عین
فرق آئے گا نہ ولولۂ اشتیاق میں
لاکھ انقلاب آئیں مزاجِ عراق میں

(72)

اہلِ زمیں کی آج ستاروں پہ ہے نظر
ممکن ہے کامیاب رہے چاند کا سفر
ہیں اپنی اپنی فکر میں ہر قوم کے بشر
مردانِ حق پرست کا جانا ہوا اگر
عباسؑ نام ور کا علم لے کے جائیں گے
ہم چاند میں حسینؑ کا غم لے کے جائیں گے

رخصت طلب ہے جسم کی اب عارضی حیات
ستّر برس کی عمر میں کچھ کم نہیں یہ بات
پچپن برس کے ملکِ سخن پر تصرفات
تیری ثنا گری ہے مرے گھر کی کائنات
مولا مرے سہیلؔ کو بھی یہ مقام دے
دونوں کی خدمتوں کو حیاتِ دوام دے

○

مرثیہ

غیر مطبوعہ

ع: دنیا کی ہر روش کا ہے انجام انقلاب

(72) بند

علامہ کے غیر مطبوعہ مرثیہ کے چند بند (بخط نجم آفندی)

مرثیہ غیر مطبوعہ

(1)

دنیا کی ہر روش کا ہے انجام انقلاب
اس کے تغیّرات کا ہے نام انقلاب
ہے وقت کی زبان کا پیغام انقلاب
ہر صبح انقلاب ہے ہر شام انقلاب
اپنی حدوں پہ جب شبِ تاریک آگئی
منزل سحر کی اور بھی نزدیک آگئی

(2)

مرضی ہے کس کی معرکہ آرائے انقلاب
فطرت کے قلب میں ہے تمنائے انقلاب
کرتا ہے ذرّہ ذرّہ تقاضائے انقلاب
ہوتا ہے ہر قدم پہ تماشائے انقلاب
گردش زمیں میں ہے حرکت آسمان میں
جو آج ہے وہ کل نہ رہے گا جہان میں

(3)

تاریکیٔ افق سے ابھرتے ہیں قافلے
راہوں کے پیچ و خم سے گزرتے ہیں قافلے
منزل کی آڑ لے کے ٹھہرتے ہیں قافلے
دم عزم و اعتماد کا بھرتے ہیں قافلے
یہ زندگی سفر کے سوا اور کچھ نہیں
موت ایک رہگذر کے سوا اور کچھ نہیں

(4)

تاریخ کہہ رہی ہے اک ایسے سفر کا حال
دنیائے اعتبار میں جس کی نہیں مثال
ہے جادۂ وفا پہ کچھ افراد خوش خصال
سالارِ قافلہ تھا علیؑ ولی کا لال
نکلا تھا گھر کو چھوڑ کے دنیا کے جبر سے
رویا لپٹ لپٹ کے جو نانا کی قبر سے

(5)

اس حال میں حسینؑ کو کیا یاد آگیا
عزم و ثباتِ شیرِ خدا یاد آگیا
بیٹے کو ماں کا طرزِ دعا یاد آگیا
وہ کمسنی کا عہدِ وفا یاد آگیا
نانا سے کررہا تھا نواسا بیانِ دل
احساس کی زبان تھی اور داستانِ دل

(6)

کی عرض امرِ حق کی حفاظت ہمیں سے ہے
دنیا میں احترامِ شریعت ہمیں سے ہے
روشن چراغِ عہدِ رسالت ہمیں سے ہے
سامانِ سرخروئی ملت ہمیں سے ہے
دنیا کی زد سے دینِ خدا کو بچائیں گے
حق پر جو آئی تو پلٹ کر نہ آئیں گے

(7)

بات اتنی بڑھ گئی کہ وطن کی زمیں ہے تنگ
شاہی کے اشتیاق نے بدلا ہے دیں کا رنگ
ارباب زر کو پاسِ شریعت ہے وجہ ننگ
ہوتی ہے ایک فیصلہ کن خیر و شر کی جنگ
خواہش ہے وقت کی قدم آگے بڑھائیں ہم
توفیقِ ایزدی ہو تو کچھ کر دکھائیں ہم

(8)

مذہب کی زندگی کو ہے قوت کی جستجو
اعزاز کی وقار کی عظمت کی جستجو
حُسنِ عمل کی شانِ شجاعت کی جستجو
ایمان کررہا ہے شہادت کی جستجو
جلدی مہم یہ سر ہو دعا دیجیے ہمیں
منزل بلا رہی ہے رضا دیجیے ہمیں

(9)

کیا وقت تھا کہ جب کوئی غم تھا نہ خلفشار
کرتے تھے آپ دوش پہ اپنے ہمیں سوار
اب یہ گلا ہے اور ہے شمشیرِ آبدار
کانوں میں گونجتی ہے اک آواز بار بار
میدانِ کربلا نے پکارا ہے الوداع
نانا ہمیں قضا نے پکارا ہے الوداع

(10)

نانا سے اذن لے کے اٹھے کارواں بڑھا
بڑھتے ہی جس کے سلسلۂ امتحاں بڑھا
سوزِ عیاں کے ساتھ ہی دردِ نہاں بڑھا
تیّار ہوکے موت پہ ہر قدر داں بڑھا
مستقبلِ سفر نہ کسی کی نظر میں تھا
بارِ امید و بیم بھی رختِ سفر میں تھا

(11)

یثرب سے جب سواریٔ سبطِ نبی چلی
رونق چلی بہار چلی زندگی چلی
حکمت چلی شعور چلا آگہی چلی
ہمراہ اہلِ بیتؑ کے پاکیزگی چلی
جن کو خلوص تھا وہ فدا کار ساتھ تھے
قدرت نے جو چنے تھے وہ انصار ساتھ تھے

(12)

خود ذوقِ کربلا تھا نگہباں حسینؑ کا
دشمن تھا گرچہ صاحبِ فرقاں حسینؑ کا
یہ وجہ احتیاط یہ عرفاں حسینؑ کا
یہ حرمتِ حرم پہ ہے احساں حسینؑ کا
کس حُسن سے مقامِ شہادت بتا گئے
کعبہ کے راستے سے سوئے کربلا گئے

(13)

پہنچے جو کربلا میں تو دنیا بدل گئی
توفیقِ دردِ زیست کا نقشا بدل گئی
فیضِ قدم سے حالتِ صحرا بدل گئی
فکرِ ستم میں نیّتِ اعدا بدل گئی
تھی فوجِ ظلم و جبر جو دشمن حیات کی
پیاسوں پہ بند ہوگئیں راہیں فرات کی

(14)

عاشور کی وہ رات وہ منزل کی ظلمتیں
ظلمت تھی مشکلوں کی تو مشکل کی ظلمتیں
سوزِ جگر تھیں پیاسوں کا ساحل کی ظلمتیں
وہ نورِ حق کے سامنے باطل کی ظلمتیں
تاریکیوں کے سائے میں سارا جہان تھا
پیری تھی روشنی کی اندھیرا جوان تھا

(15)

شدت کی پیاس میں شبِ عاشور کٹ گئی
تاریخ غم کا ایک ورق اور الٹ گئی
ظلمت کی فوج صبح کے رستہ سے ہٹ گئی
دم بھر میں کائنات کی قسمت پلٹ گئی
ہیبت سے ایک لشکرِ شب زندہ دار کی
تاریکیوں نے راہِ فرار اختیار کی

(16)

اُبھرا افق سے نیّر تابانِ کربلا
روشن ہوئی جبینِ بیابانِ کربلا
خیمہ سے باہر آگیا سلطانِ کربلا
وہ شاہِ بے دیار وہ مہمانِ کربلا
عہدِ ازل کا بارِ امانت لیے ہوئے
درماں و درد دونوں کو یکجا کیے ہوئے

(17)

دنیا کے بحر و بر میں تلاطم تھا رونما
جیسے کہ ختم ہونے کو ہے عمرِ ماسوا
ہر سمت کائنات کے خالق سے تھی دعا
موجوں کی عرض داشت تھی ذرّوں کی التجا
رہ جائے بات اِس شہِ بوتراب کی
ضد سے مچل رہی تھی کرن آفتاب کی

(18)

وہ صبح کا سماں وہ جلالت حسینؑ کی
کتنے دلوں پہ نقش ہے صورت حسینؑ کی
ہو جیسے زندگی کو ضرورت حسینؑ کی
تھی بحر و بر کے قلب میں ہیبت حسینؑ کی
صحرا پکارتا تھا کہ میں بے قصور ہوں
دریا کو تھی یہ شرم کہ پیاسوں سے دور ہوں

(19)

اس قافلے میں تھیں وہ خواتین ذی وقار
تطہیر کا جلال تھا خود جن کا پردہ دار
پہلے کبھی ہوئی تھیں نہ اس طرح بے دیار
محسوس ہوگیا تھا کہ ہے وقتِ کار زار
سب منزلِ وفا کی طرف رہ نورد تھیں
اس گھر کی عورتیں بھی شجاعت میں مرد تھیں

(20)

زینبؑ نے راہِ صبر کو آسان کردیا
ایثار کے کمال کو ایمان کردیا
قائم جہادِ زیست کا عنوان کردیا
اولاد کو اصول پہ قربان کردیا
نذرِ وفا امامِ وفا نے قبول کی
لٹ کر بھی مطمئن تھی نواسی رسولؐ کی

(21)

مارے گئے جو عونؑ و محمدؑ سے دوپسر
زینبؑ نے یوں اٹھائی سوئے آسماں نظر
اک ہاتھ اِس کی لاش پہ اک اُس کی لاش پر
چپ رہ گئی یہ کہہ کے وہ خاتون خوش سیر
قسمت کی تیرگی نے یہ دین بھی دکھادیے
اس گھر کے دو چراغ تھے وہ بھی بجھا دیے

(22)

جن کو بڑی امیدوں سے پالا بڑا کیا
ان کو نثارِ حوصلہ کربلا کیا
یوں مامتا نے حقِ امانت ادا کیا
ٹکڑوں کو دل کے قرض سمجھ کر جدا کیا
بنتِ علیؑ کے پیشِ نظر ہر مقام تھا
بیٹے خدا کی دین تھے بھائی امامؑ تھا

(23)

عباسؑ ہوگئے جو اجازت سے سرفراز
نکلے تلاشِ آب میں پیاسوں کے چارہ ساز
ساحل کو تھا عروجِ مقدر پہ فخر و ناز
کچھ اور بڑھ گیا حق و باطل کا امتیاز
تھی دشمنوں کو ضد کہ نہ اس سمت آیئے
دریا پکارتا تھا کہ تشریف لایئے

(24)

کرتے ہوئے ہجوم کو دشمن کے منتشر
ساحل کی حد پہ تھم گئے عباسِ نامور
تشنہ لبوں کی طرح نہ پانی پہ کی نظر
چلّو میں لے کے پھینک دیا سطحِ آب پر
عباسؑ سے وہ درس ملا ہے فرات کو
کوتاہ دامنی کا گِلا ہے فرات کو

(25)

تعلیم صبر و شکر ملی تھی امامؑ سے
نسبت تھی تشنگی کو شہادت کے جام سے
واقف تھے خوب ایسی وغا کے مقام سے
اذنِ جہاد پایا تھا بچوں کے نام سے
پانی سے مشک بھرتے ہی دریا سے ہٹ گئے
سیدھے ہوئے علم کو سنبھالا پلٹ گئے

(26)

کاندھے پہ وہ علم تھا جو اب تک ہے یادگار
عزم و عمل کا جاہ و جلالت کا شاہکار
جنبش پہ جس کی عظمتِ قومی کا انحصار
سایہ میں جس کے ہوگا دو عالم پہ اقتدار
وابستہ جس سے حمزہؓ و جعفرؓ کی یاد تھی
خود جس کے دل میں فاتحِ خیبر کی یاد تھی

(27)

دیتا اگر علم کو زباں ربِّ دوجہاں
ہوتے ہزار نکتۂ فتح و ظفر عیاں
کہتا یہ سب سے معرکۂ حق کی داستاں
رکھا ہے احتیاطِ مشیت نے بے زباں
پنہاں حقیقتوں کی گرہ کھولتا نہیں
بات آپڑی ہے یہ کہ علم بولتا نہیں

(28)

نرغہ کیے ہوئے جو سپاہِ یزید تھی
زخمی تھا سارا جسم نقاہت شدید تھی
دل تھا قوی کہ دل میں ابھی اک امید تھی
اور یہ امید بابِ ظفر کی کلید تھی
ہمت پہ مشک مشک میں پانی گواہ تھا
ہاتھ اس کے کٹ چکے تھے مگر روبراہ تھا

(29)

عباسؑ کو تھا نام بھی بیعت کا ناگوار
ذکرِ اماں سے تھا دلِ درد آشنا کو عار
نازاں تھا اپنی وضعِ وفا پر وفا شعار
سمجھا دیا یہ دل کو تو آیا کہیں قرار
جز فکرِ مشک اب کوئی غم ساتھ ہی نہیں
بیعت کا کیا سوال ہے جب ہاتھ ہی نہیں

(30)

ٹوٹی یہ آس تیر جب آیا ہے مشک پر
گھوڑے سے جب گرے ہیں علمدارِ نامور
آنکھوں میں دم حسینؑ کے خیمہ پہ تھی نظر
آخر اسی جگہ سے کیا آخری سفر
عباسؑ کس مقامِ تمنا پہ رہ گئے
پیاسوں کے غم میں ساحلِ دریا پہ رہ گئے

(31)

تاعصر حق کی راہ دکھاتے رہے حسینؑ
فرمانِ کردگار سناتے رہے حسینؑ
حکمِ رسولؐ یاد دلاتے رہے حسینؑ
لاشے مجاہدوں کے اٹھاتے رہے حسینؑ
اب کون ایسی صبر کی قوت دکھائے گا
کوئی امامِ وقت نہ لاشے اٹھائے گا

(32)

اک لاش یادگار برادر کی لاش تھی
پیشِ نظر شبیہ پیمبرؐ کی لاش تھی
ساحل پہ ہمنِ فاتحِ خیبر کی لاش تھی
ہاتھوں پہ بے زباں علیؑ اصغر کی لاش تھی
یہ شان منفرد ہے شہِ تشنہ کام کی
مقتل میں دیدنی تھی شجاعت امامؑ کی

(33)

بعدِ وغا بڑھا جو شہیدوں کا سوگوار
آنکھوں میں اک جلال تھا چہرے پہ اک وقار
روشن جبیں سے شوقِ شہادت تھا آشکار
باہر ہوئی قیام کے پردے سے ذوالفقار
ہیبت وہ تھی کہ قلبِ جہاں سرد ہوگیا
مغرب میں آفتاب کا منہ زرد ہوگیا

(34)

غربت میں بیکسی میں سہارا کوئی نہ تھا
کرتا جو اپنی موت گوارا کوئی نہ تھا
ہوتا جو بڑھ کے معرکہ آرا کوئی نہ تھا
تنہا مہِ مبیں تھا ستارا کوئی نہ تھا
بے اختیار حق کے ولی یاد آگئے
تلوار کھینچتے ہی علیؑ یاد آگئے

(35)

سب ختم ہوچکی تھی بضاعت حسینؑ کی
جو کررہے تھے صبح سے خدمت حسینؑ کی
کام آچکے تھے لے کے اجازت حسینؑ کی
لشکر تھا اب کوئی نہ قیادت حسینؑ کی
اک خالقِ سرور و غمِ روزگار تھا
اک جبر و اختیار کا پروردگار تھا

(36)

پائی جو غور و فکر کی فرصت حسینؑ نے
محسوس کی صدائے مشیت حسینؑ نے
دیکھی قضائے مرضیِ قدرت حسینؑ نے
ظاہر کیا کمالِ شجاعت حسینؑ نے
مانوس تھے جو حق کے پیام و سلام سے
آگے بڑھے اجازتِ ربِّ انام سے

(37)

اس سمت بے شمار ضلالت کے تھے ہدف
تنہا اُدھر امامِ دوعالم تھے سر بکف
ترتیب اِدھر تھی ظلم مکمل کی صف بہ صف
یکجا تھی پوری قوتِ اسلام اس طرف
دیکھا جو محوِ جنگ شہِ دیں پناہ کو
خیبر کی یاد آگئی اہلِ نگاہ کو

(38)

اب خیر و شر کا معرکہ آیا شباب پر
حملہ تھا جانشینِ رسالتؐ مآب پر
ذرّات کی ہو جیسے یورش آفتاب پر
حیرت تھی کائنات کو اس انقلاب پر
رخ زندگی کا راہِ ترقی سے پھر گیا
ایماں کا چاند کفر کی بدلی میں گھر گیا

(39)

کہتے ہیں سب حیات ہے ممنونِ ارتقا
جلوے ہیں شش جہات کے مرہونِ ارتقا
فطرت کا دل ازل سے ہے مفتونِ ارتقا
اس پر بھی کربلا میں ہوا خونِ ارتقا
حالت یہ دیکھ کر شہِ والا صفات کی
میداں میں سانس رکنے لگی کائنات کی

(40)

سب لٹ چکا تھا دشت میں سامانِ زندگی
نرغہ میں تھا خزاں کے گلستانِ زندگی
بے رونقی تھی رونقِ ایوانِ زندگی
خود زندگی مٹانے لگی شانِ زندگی
حملے امامؑ پر تھے اثر شش جہات پر
زردی تھی موت کی سی رُخِ کائنات پر

(41)

وہ زخم بے حساب وہ تشنہ لبی کا زور
وہ ضعف کا شباب وہ ناطاقتی کا زور
وہ بیکسی کا زور وہ بیچارگی کا زور
وہ بازوئے امامؑ میں پیغمبری کا زور
فوجِ عدو کے قلب میں دہشت فنا کی تھی
تلوار تھی حسینؑ کی قوت خدا کی تھی

(42)

وہ دستِ حق پرست وہ شمشیرِ جاں ستاں
اشرار کی صفوں میں قیامت کا تھا سماں
جو زد سے بچ گئے تھے وہ بزدل تھے نیم جاں
ہر سمت سے بلند تھی آوازِ الاماں
معراج سرفروشی و ایثار بن گیا
یہ معرکہ جہاد کا معیار بن گیا

(43)

حیرت اثر وہ طرزِ وغا تشنہ کام کی
دل میں کہیں خلش بھی نہ تھی انتقام کی
کس منہ سے ہو ثنا شہِ گردوں مقام کی
ہمت تھی یہ حسینؑ علیہ السلام کی
کانٹوں کو پھول بن کے مہکنا سکھا دیا
صحرا کو خون دے کے گلستاں بنا دیا

(44)

اسلام کے اصول سے تھی سرکشی کی جنگ
ایمان کے وقار سے تھی گمرہی کی جنگ
انصاف کے شعار سے تھی رہزنی کی جنگ
برپا تھی کربلا میں خدا سے خودی کی جنگ
آخر میں جس کا ایک سپاہی حسینؑ تھا
یہ کوئی عام جنگ نہ تھی فرض عین تھا

(45)

وہ جنگ تھی کہ دورِ فلک بدحواس تھا
قلبِ عدو میں خون کے بدلے ہراس تھا
اور اس طرف زبان پہ شکر و سپاس تھا
پھر بھی امامِ وقت کو اُمت کا پاس تھا
گرتی ہوئی وہ برقِ شرر بار روک لی
کچھ سوچ کر حسینؑ نے تلوار روک لی

(46)

سمجھا یہ ظالموں نے اب وقت آگیا
پائے ثبات عزم و عمل لڑ کھڑا گیا
بندہ ادھر اشارۂ معبود پاگیا
دم بھر کو حرب و ضرب کی قوت دکھا گیا
نکلا نہ تھا وہ گھر سے لڑائی کے واسطے
کوشش تھی ایک راہنمائی کے واسطے

(47)

بھٹکا ہوا جہاں کو جو پایا حسینؑ نے
سب کچھ لٹا کے حق کو بچایا حسینؑ نے
جادہ نئی روش کا دکھایا حسینؑ نے
سجدہ میں رکھ کے سر نہ اٹھایا حسینؑ نے
اہلِ نظر کا حوصلۂ دل بڑھادیا
اس آخری نماز کو منزل بنا دیا

(48)

تسکین کی تلاش میں زہراؑ سے جا ملا
دنیا کا رنگ دیکھ کے بابا سے جاملا
بچپن کی یاد آئی تو نانا سے جا ملا
سر کو جھکا کے مرکزِ اعلیٰ سے جاملا
یہ درس دے گیا وہ شہادت کی راہ میں
سجدہ بھی اک قدم ہے محبت کی راہ میں

(49)

ہے اس علیؑ کا لال یہ شاہِ فلک سریر
جس کے سکونِ قلب کی ملتی نہیں نظیر
خیبر شکن محافظِ اسلام قلعہ گیر
سجدہ میں جس کے پاؤں سے کھینچا گیا ہے تیر
اندازِ بندگی کو نئی آن بان دی
آیا وہی مقام تو بیٹے نے جان دی

(50)

طوفان صبر و جوشِ حمیت عجیب ہے
مقتل میں پاسِ وضعِ محبت عجیب ہے
ذوقِ وصال و شوقِ شہادت عجیب ہے
سر جائے یا رہے یہ عبادت عجیب ہے
ملّت نثارِ حُسنِ عمل کے یقین پر
ایسی نماز پھر نہ ہوئی اس زمین پر

(51)

جو زینتِ متاعِ رسالتؐ ہے وہ نماز
آئینۂ قیامِ قیامت ہے وہ نماز
جو حُسنِ صبر و نازشِ ملّت ہے وہ نماز
قربان جس پہ روحِ عبادت ہے وہ نماز
کچھ اس طرح حسینؑ نے درسِ وفا دیا
دنیا کو بارگاہِ خدا میں جھکا دیا

(52)

جو دین پر حسینؑ کا احساں ہے وہ نماز
جو شانِ عبدیت کی نگہباں ہے وہ نماز
جس کے جلو میں رحمتِ یزداں ہے وہ نماز
جو مستقل نمونۂ ایماں ہے وہ نماز
سر یوں رہِ خدا میں جھکا کر گئے حسینؑ
ذرّوں کو سجدہ گاہ بنا کر گئے حسینؑ

(53)

کس شان سے شہید ہوا جانِ مرتضیٰؑ
وہ فاطمہؑ کا لال وہ محبوبِ مصطفیٰؐ
دل میں نہ کوئی غم نہ زباں پہ کوئی گلا
سر کٹ رہا تھا اور لبوں پر تھی یہ صدا
قربِ خدائے درد کی لذت نصیب ہو
اے نفسِ مطمئن تجھے راحت نصیب ہو

(54)

دنیا کو کربلا سے نیا راستہ ملا
منزل ملی مقام ملا مدعا ملا
اس در کی جستجو میں درِ مصطفیٰؐ ملا
نورِ خدا کی راہبری سے خدا ملا
اس شامِ غم کا ذکر سبیلِ نجات ہے
خونِ حسینؑ سرخیِ صبحِ حیات ہے

(55)

دل کو غمِ حسینؑ ملا زندگی ملی
صدقے ہو جس پہ ہوش بھی وہ بیخودی ملی
ایمان کو وقار ملا پختگی ملی
انسانیت کو ایک نئی روشنی ملی
یوں شانِ صبر و شکر دکھاتا چلا گیا
شمعیں سی ہر قدم پہ جلاتا چلا گیا

(56)

تلوار کی برش سے نہ کم تھی حرم کی راہ
کوفے کو قید ہوکے چلے حریت پناہ
عزم و ثبات و صبر جلالت کے تھے گواہ
تھرا کے گر پڑی اگر اٹھی کوئی نگاہ
پیشِ خدا گیا وہ شہادت کی شان سے
گزرے یہ سوگوار نئے امتحان سے

(57)

میدان میں شہیدوں کے لاشوں کو چھوڑ کے
فرشِ زمیں پہ عرش نشینوں کو چھوڑ کے
شعلوں کے مد و جزر میں خیموں کو چھوڑ کے
مقتل میں بد دعا کے ارادوں کو چھوڑ کے
ایثار کا وہ رخ وہ روش اختیار کی
قدموں نے بڑھ کے راہِ عمل استوار کی

(58)

وہ سخت امتحاں کہ ہزار امتحاں نثار
اس خامشی پہ محشر آہ و فغاں نثار
تسبیحِ شکر وہ کہ صلوٰۃ و اذاں نثار
تمکین قید و بند پہ آزادیاں نثار
غرقِ عرق تھے شرم سے قیدی جدھر گئے
پر مقصدِ حسینؑ کی تکمیل کر گئے

(59)

تکمیل کی یہ شان تھی تکمیلِ دینِ حق
اہلِ زباں نے چھوڑ دیا ذکرِ ما سبق
تاریخِ انقلاب نے الٹا نیا ورق
ہے کون ان سے بڑھ کے حکومت کا مستحق
حق کے تصرفات پہ قبضہ انھیں کا ہے
تا حشر جو چلے گا وہ سکّہ انھیں کا ہے

(60)

گزرے جدھر سے وقت کا نقشہ بدل دیا
کیا صبر تھا کہ ظلم کا چہرہ بدل دیا
ہنسنے کا اشک و غم نے ارادہ بدل دیا
طرزِ نگاہ اہلِ تماشہ بدل دیا
تہرِ خدا کو تیغ بکف دیکھنے لگے
گھبرا کے آپ اپنی طرف دیکھنے لگے

(61)

حقّانیت کی شان دکھاتے ہوئے چلے
قیدی خدا کی راہ بتاتے ہوئے چلے
خونِ جگر سے رنگ جماتے ہوئے چلے
خاموش رہ کے درد سناتے ہوئے چلے
اس ضبط و غم کی مرثیہ خوانی ہے آج تک
روکے تھے اشک یوں کہ روانی ہے آج تک

(62)

زادِ سفر کے واسطے اللہ رے اہتمام
رسّی میں گردنیں تھیں تو لب پر خدا کا نام
حیرت سے دیکھتے تھے اسیروں کو خاص و عام
کتنوں کے دل بدل دئے کوفہ سے تا بہ شام
غفلت زدوں کو نیند سے آخر جگا گئیں
قربانیاں کمال کے نقطے پہ آ گئیں

(63)

ڈوبے ہوئے تھے مرضیِ پروردگار میں
ایسا دلوں پہ جبر کیا اختیار میں
ہے آج تک جگہ نگہِ اعتبار میں
چھوڑے ہیں ایسے نقشِ قدم رہگذار میں
گھِر کر ہجومِ غم میں سنبھلنا سکھا دیا
قوت کو صبر و ضبط میں ڈھلنا سکھا دیا

(64)

پہنچے جو شام میں یہ گرفتارِ کربلا
لائے تھے اپنے ساتھ سب آثارِ کربلا
ناواقفوں پہ کھل گئے اَسرارِ کربلا
کیا پُر اثر تھا خطبۂ بیمارِ کربلا
اٹھی ہر اک طرف سے صدا شورشین کی
دربار تھا یزید کا مجلس حسینؑ کی

(65)

ان کے تصرفات سے ملّت کی شان ہے
اسلام کی نمود شریعت کی شان ہے
باطل ہے دم بخود وہ حقیقت کی شان ہے
دنیا میں ان کے دم سے شرافت کی شان ہے
ہر بارِ غم اٹھالیا ہر ظلم سہ گئی
انسانیت اسی کے سہارے سے رہ گئی

(66)

ہمت ہے استوار مصیبت کے ذکر سے
آتا ہے صبر عالمِ غربت کے ذکر سے
ہوتا ہے سر بلند شجاعت کے ذکر سے
بڑھتا ہے خوں رگوں میں شہادت کے ذکر سے
مایوسیوں میں فتح کا امکاں ہے آج بھی
عزمِ حسینؑ عظمت انساں ہے آج بھی

(67)

قائم جہاں میں سلسلۂ صبح و شام ہے
اس سلسلے کی حد پہ نیا اہتمام ہے
ہوگا سفر شروع ابھی تو قیام ہے
دنیا کو انتظار ظہورِ امامؑ ہے
جب دستِ غیب پردۂ غیبت اٹھائے گا
خونِ حسینؑ ایک نیا رنگ لائے گا

(68)

اے بانیانِ بزمِ عزا یہ نہ بھولیے
اے ساکنانِ شہرِ وفا یہ نہ بھولیے
دلدادگانِ کرب و بلا یہ نہ بھولیے
بہرِ رسولؐ بہرِ خدا یہ نہ بھولیے
غم ہے تو غم میں شوکت و عظمت بھی چاہیے
مومن کے آنسوؤں میں حرارت بھی چاہیے

(69)

سرمایۂ نجات ہے جوشِ ولا مجھے
تقدیر سے رہا نہ کوئی اب گلا مجھے
ہے حُبِّ اہل بیتؑ ہی گویا صلا مجھے
یہ ہے صلا ..... تو سب کچھ ملا مجھے
اب صرف یہ نوازش تقدیر چاہیے
مدح و ثنا میں قوتِ تاثیر چاہیے

(70)

آقا کے در پہ محوِ سجود وفا ہوں میں
گہرائیوں سے دل کی شریکِ عزا ہوں میں
حکمِ خدائے پاک سے وقفِ ثنا ہوں میں
قرآں میں جو لکھا ہے وہی کہہ رہا ہوں میں
انداز مدح اور ہیں ممدوح ایک ہے
قالب جدا جدا ہیں مگر روح ایک ہے

(71)

اے کار سازِ خالقِ کُل مقصدِ حیات
اے بے نیازِ عالمِ مطلوبِ کائنات
گنجینۂ محاسن و مجموعۂ صفات
اے وہ کہ حدِ فکر سے آگے ہے تیری ذات
میرے قلم میں میری زباں میں اثر رہے
مجھ پر شہیدِ کرب و بلا کی نظر رہے

(72)

مدت کے بعد وقت کا جب مقتضا ہوا
اک آفتاب لطف و کرم رونما ہوا
دل کا قرار دل کا سہارا عطا ہوا
نورِ نظر سے نور نظر کا سوا ہوا
خوش بخت و شاد کام ہمیشہ جہاں میں رکھ
صدقہ حسینؑ کا اسے اپنی اماں میں رکھ

○